بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

داعی اسلام - شخصیت اور پیغام

شاہ اجمل فاروق ندوی

شخصیات اللہ کے جاری وساری نظام کے مطابق جاں بہ حق ہوجاتی ہیں۔ لیکن وہ اعمال، وہ صفات وخصوصیات، جن کو شخصیت سازی میں دخل رہتا ہے، وہ باقی رہتی ہیں۔ متبعین کو چاہیے کہ شخصیات کے لیے رفع درجات کی دعا کریں، استغفار کریں اور اُن اعمال رفیعہ کو اپنانے کی کوشش کریں، جن کی بہ دولت انھیں یہ مقام خاص ملا۔ فبھد اھم اقتدہ (تو ان کے راستے کی پیروی کرو) کا یہی تقاضا ہے۔

محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق حقی نور اللہ مرقدہٗ

داعی اسلام

مولانا سیّد عبداللہ حسنی ندوی

شخصیت اور پیغام

شاہ اجمل فاروق ندوی

مکتبہ الفاروق

G5/A ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

جملہ حقوق بہ حق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	داعی اسلام-شخصیت اور پیغام
مصنف	:	شاہ اجمل فاروق ندوی
صفحات	:	۲۲۴
سال اشاعت	:	۲۰۱۴م
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت	:	-/۱۲۰ روپے
کمپوزنگ	:	ایس.آر.کمپیوٹرس 9810842493
ناشر	:	مکتبہ الفاروق

G5/A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

فون: 26970736 (0091-11)

سیل: 9818327947, 9654058854

DAAIY-E-ISLAM
SHAKHSIYAT AUR PAIGHAM
By: SHAH AJMAL FAROOQ NADWI
Pages: 224 Price: Rs.120/-

ملنے کے پتے

☆ ندوی بک ڈپو، ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس 93، لکھنؤ، یوپی

☆ کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد، دیوبند، یوپی

☆ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

☆ البدر بک سنٹر، مہاجنی ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی

☆ سید احمد شہید اکیڈمی، تکیہ کلاں، رائے بریلی، یوپی

☆ مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی، بھٹکل، کرناٹک

ترتیب

پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۹
مقدمہ	مصنف	۱۵
باب اوّل: کتاب زندگی کے ۵۶ اوراق ایک نظر میں		۲۱
کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم		۲۴
والد		۲۵
دادا		۲۸
پردادا		۳۰
ولادت		۳۳
ماحول		۳۳
بچپن		۳۵
تعلیمی زندگی		۳۶
ایک دل چسپ بات		۴۰
سلسلۂ تربیت		۴۱
مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی		۴۲
مولانا محمد زکریا کاندھلوی		۴۴
مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی		۴۵
مولانا شاہ ابرار الحق حقی		۴۷
مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی		۴۹

میدان عمل میں ۵۴
تدریس ۵٦
والد محترم کی وفات ۵۷
طرز تدریس ٦۰
(الف) تصحیح عبارت ٦۰
(ب) لغوی تشریح ٦۱
(ج) تشریح ٦۱
(د) باطل افکار ونظریات کا رد ٦۲
(ہ) شفقت ونرمی ٦۳
درس حدیث ٦۵
درس حجۃ اللہ ٦۷
اصلاح وتربیت ۷۱
(۱) بیعت وارشاد ۷۳
اظہار مشیخت سے دوری ۷۴
دوسروں کی طرف رجوع کا مشورہ ۷۵
حلقۂ ارادت ۷٦
حقیقی تصوف کے علم بردار ۷۷
تعلق بالقرآن پر زور ۷۸
شرک وبدعت سے نفرت ۷۹
اتباع سنت کی تاکید ۸۰
کامل اتباع سنت کی دعوت ۸۰
احوال صحابہ کے مطالعے کی ترغیب ۸۱
ملفوظات کے متعلق محتاط رویہ ۸۲

(۲) خطابت ۸۴
شوق نہیں، ضرورت ۸۵
درمیانی انداز خطابت ۸۷
وقت کی پابندی ۸۸
(۳) تحریر ۹۰
عربی اسلوب تحریر ۹۳
اردو اسلوب تحریر ۹۵
(۴) انفرادی ملاقاتیں ۹۷
دعوت ۱۰۰
دعوتی کام کا آغاز ۱۰۲
اصول دعوت ۱۰۳
(۱) توحید خالص اور ترک شرک ۱۰۳
(۲) مدعو کا اطمینان قلب ۱۰۴
(۳) ویدوں سے محتاط استفادہ ۱۰۵
(۴) نومسلموں کی تربیت ۱۰۶
(۵) اخفاء ۱۰۶
دعوتی طریقہ کار ۱۰۸
(۱) پیام انسانیت ۱۰۹
(۲) انفرادی ملاقاتیں ۱۱۰
(۳) لٹریچر کی تیاری ۱۱۱
(۴) لٹریچر کی نمائش ۱۱۳
(۵) کیمپوں کا انعقاد ۱۱۳
(۶) طلبہ کے لیے مقابلے ۱۱۳
(۷) دعوتی سینٹر کا قیام ۱۱۴

ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل؟ ۱۱۵
علالت ۱۱۷
سفر حج ۱۱۷
مرض وفات ۱۱۸
آخری رمضان ۱۱۹
بیماری کی شدت ۱۲۰
"کام ہمارے بعد بھی ہوتا رہے گا" ۱۲۱
آخری عید ۱۲۱
صبر و رضا اور اتباع سنت ۱۲۲
آخری رات ۱۲۵
آخری نماز ۱۲۵
وفات ۱۲۵
وفات کے بعد ۱۲۶
پہلی نماز جنازہ ۱۲۸
دوسری نماز جنازہ ۱۲۹
اخبارات و رسائل کا خراج ۱۲۹
امتیازات و خصوصیات ۱۳۳
(۱) اتباع سنت ۱۳۳
(۲) اعتدال ۱۳۵
(۳) بے باکی ۱۳۷
(۴) جدید تقاضوں کا احساس ۱۳۸
(۵) مرکز سے وابستگی ۱۳۹
باب دوم: داعی اسلام-مشاہیر امت اور معاصرین کی نظر میں ۱۴۱
باب سوم: افکار و نظریات اور ملفوظات ۱۷۹

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
(سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

پیش لفظ

جیسے اللہ تعالیٰ نے افراد واشخاص کو بعض امتیازی صلاحیتوں اور وہبی لیاقتوں سے نوازا ہے، اسی طرح بعض خاندانوں کو بھی کسی خاص جہت سے امتیاز اور انفرادیت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کانوں کی طرح ہیں۔ تم میں سے جو لوگ زمانۂ کفر میں بہتر تھے، وہ زمانۂ اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوں گے:
"خیارکم في الجاهلية خیارکم في الإسلام" (صحیح البخاری، حدیث نمبر:۳۳۷۴)
اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قریش مکہ زمانۂ کفر میں پورے جزیرۃ العرب کی قیادت کررہے تھے۔ جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو کفر کی گھٹاؤں نے اسے گہن آلود کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ اس میں کام یاب نہیں ہوسکے، پھر جب عرب کے بہت سے قبائل دامن اسلام میں آگئے اور مکہ فتح ہوگیا تو اسلام کی کرنیں قریش مکہ کے دل ودماغ تک بھی پہنچ گئیں اور ان کے قلوب بھی ایمان کے اجالوں سے روشن ہوگئے۔ مکہ کے پیش تر لوگ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے صرف ایک دو سال پہلے ایمان کی سعادت سے سرفراز ہوئے؛ لیکن آپ ﷺ کی وفات کے بعد جزیرۃ العرب اور اسلامی مملکت کی قیادت قریش ہی کے ہاتھ میں آئی اور ساری گردنیں ان کی سمع وطاعت کے لیے جھک گئیں۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بل کہ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ من جانب اللہ قائدانہ صلاحیت کے حامل تھے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "الأئمة من قريش"
(سنن النسائی الکبری، حدیث نمبر:۵۹۴۲، شعب الإیمان للبیہقی، حدیث نمبر:۱۶۱۴)

یعنی "میرے بعد تمہیں قیادت قریش کو سونپنی چاہیے"؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کو بہ خوبی اندازہ تھا کہ قریش کے سوا کسی اور کی قیادت کو عرب تسلیم نہیں کریں گے اور اگر اس کے خلاف کرنے کی کوشش کی گئی تو انتشار وانارکی پیدا ہوگی، چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد ۳۰ رسال خلافت راشدہ کا دور رہا، پھر قریب سو سال بنو امیہ کی حکومت رہی اور اس کے بعد کئی صدیوں تک بنو عباس کی حکومت رہی، اس کے علاوہ گاہے گاہے عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں فاطمیوں، امویوں اور ہاشمیوں کا اقتدار رہا اور اس طرح آپ ﷺ نے مستقبل کے بارے میں جو اندازہ فرمایا تھا، وہ حرف بہ حرف پورا ہوا۔

دنیا کے مختلف خطوں میں ایسے خانوادے رہے ہیں جن کی کئی کئی پشتوں نے اسلام اور علوم اسلامی کی خدمت کا ایک نقش لازوال قائم کیا ہے۔ ہندستان میں اگر ماضی قریب کی تاریخ کو دیکھا جائے تو اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مفتی نور الٰہی بخش کاندھلویؒ اور فرنگی محل کے خانوادوں کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی موفق خاندانوں میں ایک خاندان علم اللّٰہی ہے، جس سے عہد صحابہ کی یاد تازہ کرنے والی ہستی سید احمد شہید والا صفات کی ذات ہے جو عابد شب بے دار بھی تھے اور صاحب کارزار بھی۔ اسی خاندان کی ایک صاحب نظر اور صاحب معرفت شخصیت حضرت مولانا عبدالحی حسنی تھے، جو طویل عرصے تک ندوۃ العلماء کے ناظم رہے۔ اگر ایک دنیا میں دو آفتاب ہوا کرتے تو میں کہتا کہ ان کے دو صاحب زادے تھے، دونوں علم ومعرفت کے آفتاب جہاں تاب۔ اللہ نے دونوں ہی کو غیر معمولی بصیرت، تزکیہ وتربیت کی صلاحیت، ورع وتقویٰ اور روشن ضمیری سے نوازا تھا۔ فرق یہ ہے کہ بڑے بھائی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی زیادہ توجہ پیشہ طب کے ذریعے خدمت خلق، ندوہ کے انتظام وانصرام، طلبہ اور بالخصوص اپنے برادر عزیز کی علمی وفکری تربیت پر رہی؛ اس لیے لوح وقلم کی دنیا سے انھوں نے زیادہ تعلق نہیں رکھا؛ لیکن وہ اپنی صلاحیت وصالحیت کی وجہ سے اپنے بزرگوں کے بھی محبوب رہے اور اپنے عزیزوں کے بھی۔ دوسرے صاحب زادے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت سے کون صاحب علم ناواقف ہوگا؟ وہ بلند پایہ مصنف، صاحب طرز ادیب،

حمیت ایمانی سے گھرے اسلامی مؤرخ، دین کے داعی، دل دردمند وفکر ارجمند کے مالک اور زبان ہوش مند کے ساتھ روشن دماغ اور روشن دل کے حامل تھے۔ وہ اپنی وسیع القلبی اور سیر چشمی کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے ہر حلقے میں محبت وعزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ عالم اسلام میں ہندی نژاد ہونے کے باوجود ان کو جو مقبولیت و پذیرائی حاصل ہوئی، برصغیر میں شاید اس کی کوئی اور مثال نہ مل سکے۔

مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کے صاحب زادے مولانا سید محمد حسنیؒ اس شان کے عالم ہوئے کہ گویا کسی معلم غیب نے اُن کو پڑھا دیا ہو۔ انھوں نے باضابطہ طریقے پر عربی قواعد وادب کی تعلیم حاصل نہیں کی؛ لیکن وہبی طور پر انھیں اس کا ایسا اعلیٰ ذوق اور بہترین سلیقہ عطا کیا گیا تھا کہ عرب علماء ان کی تحریریں پڑھ کر سر دھنتے تھے اور خود ان کے عم محترم ان کے ادبی ذوق کی تحسین وستائش کرتے ہوئے ان کو از راہ تواضع وشفقت اپنے آپ پر فائق قرار دیتے تھے؛ لیکن ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے کم عمری میں ہی علم وعمل کی وہ منزلیں طے کرلیں، جو اللہ کی طرف سے ان کے لیے مقدر تھیں اور صرف ۴۴ سال کی عمر میں جہانِ فانی کو داغ فراق دے گئے۔ وہ اپنے والد ماجد کے اکلوتے صاحب زادے تھے؛ البتہ انھوں نے تین فرزند چھوڑے، تینوں فہیم وسلیم اور صلاحیت وصالحیت کے حامل۔ ان میں بڑے صاحب زادے صاحب تذکرہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ تھے۔

مولانا عبداللہ حسنی ایک مقبول استاذ، صاحب بصیرت مربی، تزکیہ واحسان کی دنیا کے ماہر نباض اور ان سب سے بڑھ کر جذبۂ دعوت سے سرشار اسلام کے سپاہی تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے دادا، دادی، والد ماجد اور عم محترم ان سب کے اندر جو داعیانہ جذبہ تھا اور جو جذبہ اس خاندان میں بہت اوپر سے آرہا تھا، جس کا اثر حضرت سید احمد شہید کے بعض خلفاء خاص کر مولانا کرامت علی جون پوری میں دیکھا جاسکتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے خاص طور پر مولانا عبداللہ صاحبؒ کو ودیعت ہوا تھا۔ ان کے اندر حسنی خاندان کی تمام اخلاقی خوبیاں اکٹھا تھیں۔ تواضع، انکسار، تعلق مع اللہ، شفقت علی الخلق، خاص کر تو مسلم بھائیوں کی غم گساری، اپنے بزرگوں کا احترام، اپنے عزیزوں کی حوصلہ افزائی، تعلیم وتربیت اور

اصلاح ودعوت کے کاموں کی منصوبہ بندی، زبان وقلم اور فکر ونظر میں اعتدال۔ مجھ جیسے لوگ ان کو اس نسل میں اس خانوادے کی خصوصیتوں کا امین خیال کرتے تھے اور حالاں کہ ان کی عمر ''عمر طبعی'' کے اوسط کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہوئی؛ بل کہ بعد کو ان کی شخصیت پر لکھی گئی تحریروں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے بھی چند ماہ چھوٹے ہی تھے؛ لیکن اس کم عرصے میں اللہ نے اُن سے مختلف میدانوں میں بڑا قابل رشک اور لائق تحسین کام لیا۔

ان کا ایک بڑا وصف اخفاء حال تھا، جس کا کسی قدر اندازہ مجھے ان کی زندگی میں بھی تھا؛ لیکن ان کی وفات کے بعد جب ان کے کاموں کی وسعت، ان کے تلامذہ ومتوسلین کی غیر معمولی عقیدت اور بعض نومسلم بھائیوں کے احساس یتیمی کو دیکھا تو اس کا مزید اندازہ ہوا۔ وہ اپنی تکلیف دہ علالت میں جس طرح صبر وشکر کی تصویر بنے رہے، وہ بھی ان کے جذبۂ بندگی اور غلبۂ عبدیت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ چین عطا فرمائے، بیماری کی جس آزمائش سے وہ گزرے اس کو ان کے لیے رفع درجات کا ذریعہ بنائے۔

اسلام مردہ پرستی کا قائل نہیں ہے؛ بل کہ اس نے ان نقوش کو مٹانے کا حکم دیا ہے، جو انسان کو بزرگوں کی پرستش کی طرف لے جاتے ہیں؛ لیکن اس نے گزرے ہوئے نیک لوگوں کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ اسی مقصد کے تحت قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ قصص وواقعات پر مشتمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں بھی گزشتہ انبیاء اور ان کے اقوام کا تذکرہ اور خود آپ ﷺ کے رفقاء عالی مقام کے محاسن کا ذکر ہے، جس کو 'مناقب' کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی پس منظر میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ گزرے ہوئے لوگوں کے محاسن کا ذکر کرنا چاہیے: ''اُذکروا محاسن موتاکم'' (سنن الترمذی، کتاب الجنائز، باب آخر، حدیث نمبر: ۱۰۲۵)؛ کیوں کہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنے لیے مشعل راہ بناتا ہے، اس پہلو سے مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ کی شخصیت پر کام کی ضرورت تھی؛ تاکہ ان کے نقوشِ قدم ان کے موجودہ متعلقین کے لیے بھی اور آئندہ نسل کے لیے بھی محفوظ ہو جائیں۔ یہ ان کی شخصیت کی کشش اور اہل علم کے درمیان ان کی محبوبیت ہے کہ ان کی وفات کے بعد مختلف جرائد نے ان پر خصوصی شمارے

شائع کیے اور ان میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بڑے اہم مضامین قارئین تک پہنچے؛ لیکن اس کے باوجود ضرورت تھی کہ ان کی کوئی مربوط سوانح منظر عام پر آئے؛ کیوں کہ متفرق مضامین مکمل سوانح وتذکرہ کی ضرورت کو پوری نہیں کر پاتے۔

مجھے بے حد مسرت ہے کہ اللہ نے اس کام کی توفیق محبّ عزیز مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی کو دی، جو حضرت شیخ الہندؒ جیسی جلیل القدر ہستی سے ننہالی نسبت رکھتے ہیں اور ایک ایسے زرخیز قصبے کے متوطن ہیں جس کی شہرت مشرق سے مغرب تک ہے اور یہ حقیر بھی اس کے نمک خواروں میں ہے، یعنی دیوبند۔ ان کے والد ماجد ڈاکٹر تابش مہدی زبان وادب اور شعروسخن کی دنیا کی معروف شخصیت ہیں اور انھوں نے اپنی صلاحیت کو اسلام کی اشاعت وترجمانی کے لیے وسیلہ بنایا ہے۔ عزیز موصوف نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالمیت کرنے کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور حجاز کے علماء سے بھی فیض یاب ہوئے ہیں۔ مولانا اس وقت ”مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی“ میں ایم فل کے طالب علم ہیں؛ اگرچہ ان کی رسمی طالب عالمی کا سفر ابھی تمام نہیں ہوا ہے اور اصل مسافر علم وہی ہے جس کا سفر شوق کبھی پورا نہ ہو اور جس کی ہر منزل راستہ بنتی چلی جائے؛ لیکن اسی مرحلے میں ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصنیفات وتالیفات کا عدد ایک دہائی کو پورا کر چکا ہے، مقالات ومضامین اس کے علاوہ ہیں۔ مؤلف عزیز کی یہ ظفر مندیاں ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے، عمر میں برکت دے اور یہ متاع حیات دین کی ترجمانی اور پاسبانی میں صرف ہو۔

إن صلاتي و نسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين۔

مؤلف عزیز کی یہ کتاب مولانا حسنی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو روشنی میں لاتی ہے۔ کتاب کا پہلا باب حالات زندگی پر ہے، جس میں خاندان اور بچپن سے لے کر میدان عمل میں آنے تک کا تذکرہ ہے، ان کے طرز تدریس کا تفصیلی تعارف ہے، اصلاح و تربیت کے سلسلے میں ان کا منہج نیز ان کی خطابت اور طرز نگارش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی باب میں ان کی دعوتی خدمات کے لیے ایک حصہ مختص ہے اور مرض وفات، سفر آخرت اور

اخبار ورسائل کی طرف سے خراج تحسین کے بیانات پر اس کو مکمل کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں مشاہیر امت اور معاصرین کی طرف سے ان کی شخصیت کے بارے میں آنے والے خطوط، اخباری بیانات اور مضامین کے ذریعے ظاہر کیے جانے والے تأثرات سے اقتباسات کو جمع کر دیا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حسنی کو اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے درمیان کیسی محبوبیت اور ہر دل عزیزی حاصل تھی۔

کتاب کا تیسرا باب بڑی اہمیت کا حامل ہے، جس میں مولانا حسنیؒ کے افکار و نظریات اور دل کو چھو لینے والے ملفوظات کا ذکر ہے۔ اس میں تمام لوگوں اور خاص کر علماء اور طلبۂ مدارس کے لیے بڑی سبق آموز اور موعظت انگیز باتیں ہیں۔ خود اس حقیر نے اس حصے میں سے چند صفحات پڑھنا شروع کیا تو پورے باب کو پڑھ گیا، ان ملفوظات و اقتباسات میں مولانا حسنیؒ کی بصیرت، فکری اعتدال، شرک و بدعت سے نفرت، تعلق مع اللہ اور اپنی خاندانی خصوصیات پر استقامت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ کتاب کا اختتام "داعیٔ اسلام کا آخری پیغام- آپ کے نام" کے عنوان پر کیا گیا ہے۔ غالباً مرض وفات میں انھوں نے اپنے متعلقین کو یہ پیغام دیا ہو۔ یہ واقعی آب زر سے لکھے جانے اور دامن دل سے باندھے جانے کے لائق پیغام ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان کے اس پیغام کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں اور برادران وطن تک دین حق کی روشنی کو پہنچائیں۔

میں اس اہم تالیف پر مصنف کتاب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک ایسی شخصیت کا تذکرہ مرتب کیا ہے، جس سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہی نہیں ہوگا؛ بل کہ ان کو ایک واضح پیغام بھی ملے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب تذکرہ کو آخرت کی نعمتوں سے نوازے اور مصنف کو خدمت اسلام کی خوب خوب توفیق ارزانی فرمائے۔

۲۸ر نومبر ۲۰۱۳ء

خالد سیف اللہ رحمانی

مقدمہ

کتاب چاہے کیسی ہی ہو، اس کا موضوع یا معیار خواہ کچھ بھی ہو، وہ اپنے لکھنے والے کے افکار ونظریات اور جذبات واحساسات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر مصنف چاہتا ہے کہ اس کی کتاب جلد از جلد شائع ہو اور لوگ اس کے خیالات سے واقفیت حاصل کریں۔ لیکن یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کا مصنف وادیِ تصنیف میں نو وارد ہونے کے باوجود عجیب ذہنی کش مکش سے دوچار ہے۔ بار بار اس کے ذہن میں حسرت وغم کی ملی جلی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ کاش اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت دو تین دہائیوں بعد پیش آتی۔ لیکن پھر تقدیر الٰہی کا خیال آتے ہی دل میں کچھ اطمینان اور قدرے خوشی بھی محسوس ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نیک بندے کی سوانح لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

داعیِ اسلام مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ وفات کو ایک سال مکمل ہونے والا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی یہ خبر دے کہ مولانا کی وفات کی خبر ایک افواہ یا غلط فہمی تھی تو شاید اب بھی ان کے بے شمار معتقدین اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ اس لیے کہ یہ حادثہ اتنا اچانک اور غیر متوقع طور پر پیش آیا کہ بغیر کئی کئی تصدیقات کے کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ پھر مولانا کی جاذبیت، دل آویزی اور دعوتی واصلاحی سرگرمیاں اس شان کے ساتھ جاری تھیں کہ آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد میں مصروف

ہیں اور کسی طویل سفر پر تشریف لے گئے ہیں۔ان کی وفات کے جاں کاہ حادثے کے بعد جس طرح خواص وعوام نے اپنی بے چینی، رنج والم اور عقیدت ومحبت کا اظہار کیا، وہ ان کی مقبولیت عنداللہ کی دلیل ہے۔اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ زندہ قومیں نوحہ وماتم کے بہ جائے عزم مصمم کو اپنا شعار بناتی ہیں۔اپنے کسی قائد اور محبوب راہ نما پر غم کے آنسو تو بہاتی ہیں لیکن آنسو بہا کر چپ نہیں ہو جاتیں بل کہ اس کے پیغام کو سمجھ کر اسے اختیار کرتی ہیں۔ جانے والے کے لیے بھی اس سے بہتر خراج عقیدت کوئی نہیں ہو سکتا۔اسی خراج عقیدت کا ایک نمونہ یہ کتاب ''داعی اسلام۔شخصیت اور پیغام'' بھی ہے۔

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی وفات کے وقت راقم سطور کا قیام مدینہ منورہ میں تھا۔اس حادثے کی خبر سن کر دل ودماغ پر گہرا اثر ہوا۔جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پڑھنے والے اور ندوۃ العلماء اور اس کی فکر سے وابستہ کئی دوسرے افراد نے حرم نبوی میں غائبانہ نماز جنازہ کا بھی اہتمام کیا اور ایک تعزیتی جلسے کا بھی۔میں نے اس جلسے میں پڑھنے کے لیے ایک مختصر مضمون لکھا تھا، جس کا عنوان تھا ''اک ترے جانے سے کیا بتلاؤں کیا کیا ہو گیا''۔اس مضمون کو احباب نے کافی سراہا۔ان ہی دنوں یہ حیدرآباد کے مشہور روزنامے ''منصف'' میں شائع ہوا۔منصف سے نقل کر کے روزنامہ ''اردو ٹائمز'' ممبئی اور روزنامہ ''ندیم'' بھوپال نے بھی مختلف اشاعتوں میں شامل کیا۔ماہ ناموں میں ماہ نامہ ''پیام عرفات'' رائے بریلی اور ماہ نامہ ''المومنات'' لکھنؤ نے مولانا پر شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں جگہ دی اور ماہ نامہ ''ذکریٰ جدید'' نے بھی شائع کیا۔مضمون میں بہت مختصر انداز میں مولانا کی حیات کے اہم گوشوں کو بیان کیا گیا تھا اور ان کے مزاج ودعوتی نہج کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔سعودی عرب سے ہندستان واپسی کے بعد خیال پیدا ہوا کہ ایک مختصر کتابچے کی شکل میں مولانا کی شخصیت اور پیغام کو پیش کیا جائے تاکہ ان سے وابستہ ہزاروں معتقدین وتلامذہ اور بالخصوص یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ اور نومسلم حضرات کے لیے ان کے مقتدیٰ ورہ نما کی زندگی اور دعوت زندگی کو ہمیشہ کے لیے

محفوظ کیا جاسکے۔ کئی رفقاء و محسنین نے بھی اس طرف توجہ دلائی۔ کام کا ذہنی خاکہ تیار کرنے کے دوران ہی یہ احساس ہو گیا کہ کتابچے کی شکل میں نہ تو مولانا کی زندگی کے اہم گوشے آسکیں گے اور نہ ان کے پیغام کو پیش کیا جاسکے گا۔ اس لیے قدرے تفصیل کے ارادے کے ساتھ کام کا آغاز کر دیا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

اس کتاب کے مطالعے میں چند باتیں ذہن میں رہنی چاہییں:

(۱) یہ کتاب مولانا کی مبسوط و مفصل سوانح نہیں ہے۔ اس میں ان کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اسی لیے اس کی حیثیت سوانح کے روایتی مفہوم سے مختلف ہے۔ اس میں ابتداء سے لے کر زندگی کے اختتام تک ایسے واقعات اور حالات پر اصل توجہ دی گئی ہے جس سے ان کی دعوتی و اصلاحی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔

(۲) کتاب کے اسلوب میں سیرت و سوانح کا وہی انداز اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی بناء علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ڈالی تھی۔ یعنی پر تکلف اور بھاری بھرکم زبان سے اجتناب کرتے ہوئے حتیٰ الامکان صحیح معلومات پیش کرنے کی کوشش کی جائے اور زندگی کے حالات پر زیادہ گفتگو کے بہ جائے صاحب تذکرہ کے کام اور پیغام پر توجہ دی جائے۔ شخصیات کا ذکر آئے تو بھاری بھرکم اور پر تکلف القاب و خطابات سے احتراز کیا جائے، لیکن اس طرح کہ بے ادبی کا شائبہ تک نہ ہو۔

(۳) کتاب میں عصری اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اور مولانا کے عام عقیدت مندوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ مواد کے اختصار کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ورنہ ضخامت بہت بڑھ جاتی اور کتاب کی افادیت متاثر ہوتی۔ ایسے دسیوں مقامات ہیں جہاں بڑے اضافے کی گنجائش تھی، لیکن اس سے صرف نظر کر لیا گیا۔ مثال کے طور پر خطابت، عربی تحریر، اردو

تحریر اور تصوف وسلوک وغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے دسیوں مثالیں نمونے کے طور پر پیش کی جاسکتی تھیں۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ صرف اس لیے کہ کتاب زبان و بیان اور ضخامت دونوں لحاظ سے ہر شخص کی گرفت میں ہو اور ہر خاص و عام تک صاحب تذکرہ علیہ الرحمہ کا پیغام پہنچ سکے۔

(۴) کتاب کے آخری باب کے سلسلے میں یہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ اس باب میں پیش کیے گئے ملفوظات و اقتباسات کے لیے مولانا کی ویڈیوز سنی گئیں، تعمیر حیات کی پرانی فائلیں کنگھالی گئیں، ممکنہ طریقوں سے لوگوں سے رابطہ کیا گیا، مولانا پر شائع ہونے والے پچاسوں مضامین میں ذکر کیے گئے ملفوظات کو نکالا گیا، اپنے حافظے کی بنیاد پر بھی کچھ باتیں نقل کی گئیں اور ماہ نامہ پیام عرفات کے خصوصی شمارے میں برادرم عبداللہ پرتاپ گڑھی کے پیش کردہ ملفوظات میں سے بھی کچھ کو منتخب کیا گیا۔ یہ باب بھی دوسرے ابواب کی طرح بہت تفصیلی ہوسکتا تھا۔ لیکن ضخامت سے بچنے کے لیے اسے بھی مختصر کیا گیا اور صحت کا حتی الامکان اہتمام کرتے ہوئے مولانا کی فکر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

آج جب یہ کتاب اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے، راقم کا دل بارگاہ ایزدی میں سر بہ سجود ہے اور اس کے پاک دربار میں تشکر و امتنان کا ٹوٹا پھوٹا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔ جو کچھ ہے اسی کی توفیق سے ہے اور آگے بھی سب کچھ اسی کی رحمت و عطا سے ہوگا۔

والدین ماجدین اور اپنے مرحوم و باحیات اساتذۂ کرام کی تربیت اور نوازشات و احسانات کا شکریہ تو ادا نہیں کیا جاسکتا، البتہ ان کے حق میں رب کریم کی بارگاہ میں دعا ضرور کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے والدین اور اساتذۂ کرام کو ہر طرح کی ذہنی و جسمانی تکلیفوں سے دور رکھے اور پوری صحت و عافیت کے ساتھ ان کا سایہ دراز فرمائے۔ ساتھ ہی جو اساتذۂ کرام اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں، ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر فائز فرمائے۔

فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کتاب کے ایک ایک صفحے پر نظر ڈالی۔ بعض مقامات اور اقتباسات کو خصوصیت کے ساتھ سراہا اور پیش لفظ کے طور پر ایک وقیع تحریر بھی عطا فرمائی۔ یقیناً اس گراں قدر تحریر سے کتاب کی اہمیت و وقار میں اضافہ ہوا۔ ایسے معتدل اور متجر فقہاء اس دور میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صحت وعافیت کے ساتھ مولانا کو طویل عمر عطا فرمائے اور حاسدین کے حسد سے محفوظ رکھے۔

اس کتاب کی تیاری میں جن مصنفین کی کتابوں اور جن مضمون نگاروں کے مضامین سے مدد ملی، یہاں ان سب کا الگ الگ تذکرہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ بس دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔ بالخصوص صاحب تذکرہ کے چھوٹے بھائی اور جانشین مشفق مکرم مولانا سید بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی اور محترمی مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کے مضامین سے بڑی رہ نمائی ملی۔ اول الذکر سے زبانی بھی اہم معلومات حاصل ہوئیں اور ثانی الذکر نے رمضان المبارک میں دائرہ شاہ علم اللہ میں قیام کے دوران مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی پر اپنی مفصل سوانح کا مسودہ بغیر طلب کے فراہم کردیا اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس طرح کا علمی تعاون آج کے دور میں مشکل ہی سے ملتا ہے۔ کتاب میں ایک سے زائد مرتبہ اس مسودے کے حوالے ملیں گے۔ برادر گرامی مولانا محمد اعظم ندوی (استاد المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد) نے پیش لفظ لکھوا کر بھیجنے میں جو تعاون کیا، وہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔ اسی طرح اس کتاب کی تکمیل اتنی جلدی نہیں ہوسکتی تھی، اگر مجھے اس کی تبییض وتسوید میں اپنی اہلیہ کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ مزید یہ کہ انھوں نے میری عدم موجودگی میں مولانا کی وفات پر شائع ہونے والی خبروں کے تراشے اور اہم رسالے محفوظ کرکے اپنا قیمتی علمی تعاون دیا۔ اس طرح انھوں نے حق زوجیت تو ادا کیا ہی، حق پدری کی ادائی کی بھی کوشش کی۔ کیوں کہ ان کے والد محترم مولانا محمد رضوان ندوی (بانی جامعۃ المومنات الاسلامیہ لکھنؤ) اور صاحب تذکرہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نہایت قریبی دوست تھے۔

اللہ تعالیٰ تمام محسنین، رفقاء اور معاونین کو ان کے احسانات وتعاون کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ صاحب تذکرہ کے درجات بلند فرما کر ہمیں ان کے راستے اور پیغام کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کتاب کو مصنف کے حق میں صدقۂ جاریہ اور اپنی رضا کا ذریعہ بنائے۔ آمین

بیت الراضیہ
G5/A ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

شاہ اجمل فاروق ندوی
۲۹ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
بہ مطابق ۴ دسمبر ۲۰۱۳ء

باب اوّل

کتاب زندگی کے ۵۶ اوراق
ایک نظر میں

عجب حیرت میں ہوں کیوں کر بتاؤں میں زمانے کو
کہ ہو سکتا ہے تجھ سا اور تجھ سا ہو نہیں سکتا
داغ دہلوی

۳۰؍جنوری ۲۰۱۳ء کو فجر کے بعد ہم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پڑھنے والے ہندستان اور پاکستان کے چالیس طلبہ سعودی عرب کے قرآنی و تاریخی مقامات کی زیارت کے لیے نکلے۔ سفر کافی لمبا تھا۔ ہمیں خیبر، تبوک، مدائن صالح اور مدین ہوتے ہوئے سعودی۔ اردن سرحد تک جانا تھا۔ اس سفر کے آغاز پر ہم سب نہایت مسرور اور مگن تھے۔ بات چیت، ہنسی مزاق اور شعر و شاعری کا دور جاری تھا۔ اسی درمیان دہلی سے میری اہلیہ کا پیغام آیا۔ ''مولانا عبداللہ حسنی صاحب کا انتقال ہو گیا۔'' ذہن نے کام کرنا بند کر دیا۔ چاروں طرف شور شرابے کے باوجود ایک سناٹا سا چھا گیا۔ موصولہ پیغام کو کئی مرتبہ پڑھا۔ اس امید پر کہ شاید مجھ سے پڑھنے یا سمجھنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ لیکن پیغام وہی تھا جو میں پہلی مرتبہ پڑھ اور سمجھ چکا تھا۔ کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ کسی کو بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر کار بڑی ہمت جٹا کر دوستوں کو یہ لرزہ خیز خبر سنا ہی دی۔ سب نے سخت تأثر لیا اور ہم سب پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دوستوں کے کہنے پر میں نے بس کے مائک پر مولانا کا مختصر تعارف کرایا اور پاکستانی احباب کو بھی اس حادثے کی اطلاع دی۔ پوری بس نے قرآن کریم کی تلاوت کر کے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کی۔ اس کے بعد میں سب سے کٹ کر کھڑکی کی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دہلی، لکھنؤ، رائے بریلی اور دوسرے مقامات پر مولانا کی صحبت میں گزرے ہوئے لمحات یاد آنے لگے۔ مختلف ناحیوں سے مولانا کا سراپا نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگا۔ کبھی چلتے ہوئے، کبھی بیٹھے ہوئے، کبھی تنہائی میں آرام کرتے ہوئے، کبھی لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے، کبھی مسکراتے ہوئے اور کبھی جذباتی انداز میں تقریر کرتے ہوئے۔ بار بار مخدوم و مربی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

کا خیال آتا کہ اُن پر کیا قیامت گزری ہوگی۔ کبھی مولانا کی اہلیہ محترمہ (صاحب زادی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی) اور صاحب زادے کا خیال تڑپا کر رکھ دیتا، تو کبھی مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ، طلبہ اور مولانا کے ہزاروں مریدین، تلامذہ و معتقدین کی گھبراہٹ اور پریشانی کا احساس دل پر تیشہ چلانے لگتا۔ وطن سے دور سنسان اور وسیع وعریض صحراؤں سے گزرتے ہوئے میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ اب اس سفر کی خوشی غم میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جسم مذکورہ تاریخی مقامات سے تو گزرتا رہا، لیکن روح، دل اور دماغ لکھنؤ اور رائے بریلی میں تھے۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔

اُن کو جاتے ہوئے تو دیکھا تھا
پھر بصارت نے ساتھ چھوڑ دیا

کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم

نومبر ۲۰۰۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے انجینئرنگ فیکلٹی ہال میں جامعہ خیر النساء (للبنات) نئی دہلی کا اولین جلسۂ تقسیم اسناد بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت ملت اسلامیہ ہندیہ کے قافلہ سالار مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی فرما رہے تھے۔ مولانا سید عبد اللہ محمد حسنی ندوی جامعہ خیر النساء کے ناظم اعلیٰ بھی تھے اور سرکاری طور پر خیر النساء فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) کے صدر بھی۔ ان دونوں حیثیتوں سے جلسے میں اُن کی شرکت مہمان کے بہ جائے میزبان کے طور پر ہو رہی تھی۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق صدر عالی مرتبت کو درمیان میں ہی تشریف لے جانا تھا۔ چناں چہ اُن کے بعد مولانا عبد اللہ صاحب نے کرسی صدارت پر فائز ہوئے بغیر ہی جلسے کی صدارت فرمائی۔ نظامت راقم سطور کے ذمے تھی۔ تمام مقررین کے بعد مولانا کو دعوت خطاب دینی تھی۔ کیوں کہ مولانا کی حیثیت اس جلسے میں میزبان کی تھی، اس لیے ان کے متعلق کوئی تعارفی بات پہلے سے ذہن میں نہ تھی۔ البتہ مائک پر کھڑے ہو کر ذہن میں بے ساختہ ایک بات آئی اور میں نے عرض کر دی۔ میں نے کہا:

"حضرات! اب اس شخصیت کو دعوت دینے جارہا ہوں، جس کو ہم کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم کہہ سکتے ہیں۔ میری مراد ہے حضرت مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی سے، جن کے والد محترم مولانا سید محمد الحسنی، دادا مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور پردادا علامہ سید عبدالحی حسنی تھے۔"

سچی بات یہ ہے کہ اس وقت یہ بات بغیر کسی استحضار اور تیاری کے کہی گئی تھی۔ آج خیال آتا ہے کہ واقعتاً یہ تعبیر مولانا کی شخصیت پر کتنی صادق آتی ہے۔

والد

داعی اسلام مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی ہندستان میں عربی صحافت کے علم بردار ونقیب مولانا سید محمد حسنی ندوی کے بڑے صاحب زادے تھے۔ مولانا سید محمد حسنی (ولادت: ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۵ء، وفات: ۱۴/جون ۱۹۷۹ء) علمی حلقوں میں صرف "محمد الحسنی" کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندوی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے اکلوتے فرزند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ادب وانشاء کی حیرت انگیز صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اُن کے ایک رفیق پروفیسر مولانا سید محمد اجتباء ندوی (سابق صدر شعبۂ عربی الٰہ آباد یونی ورسٹی) نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا کہ "محمد الحسنی حقیقی معنوں میں عبقری شخص تھے"۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا محمد حسنی نے صرف ۴۴/برس عمر پائی اور اتنے کم وقت میں اُن کی تحریریں عالم عرب میں نہ صرف یہ کہ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جارہی تھیں بل کہ ایوان باطل میں ان کی تحریروں سے لرزہ بھی پیدا ہونے لگا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے "قومیت عربیہ" کا جاہلانہ نعرہ بلند کیا اور خود ہندستان کی بڑی بڑی مسلم تنظیمیں اور علماء بے سوچے سمجھے اُس کی تائید کرنے لگے۔ ۱۹۵۵ء میں عرب قومیت کی اس تحریک نے زور پکڑا اور اسی سال مولانا سید محمد حسنی نے اپنی ذاتی دل چسپی سے عربی ماہ نامہ "البعث الاسلامی" جاری کیا۔ اس وقت اُن کے والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔ انہوں نے اس رسالے کی

سرپرستی قبول فرمائی۔ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمان اعظمی ندوی (مدیر البعث الاسلامی و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) روز اول سے اُن کے دست راست رہے۔ ساتھ ہی انھیں اپنے پھوپی زاد بھائیوں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کا بھی گراں قدر تعاون حاصل رہا۔ بعد میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے اس رسالے کو اپنا ترجمان بنالیا۔ اس رسالے میں مولانا محمد حسنی نے ''قومیت عربیہ'' کے بت کو پاش پاش کرنے کے لیے پرزور اداریے اور مضامین لکھنے شروع کیے۔ ایمانی جوش وولولے سے بھرے ہوئے یہ مضامین فکر باطل پراتنے گراں گزرے کہ ہندستان میں مصری سفارت خانے نے حکومت ہند سے شکایت کی اور رسالے کے مدیر سے جواب طلب کیا گیا۔ لیکن یہ جواب طلبی ان کے رویے میں ذرہ برابر تبدیلی نہ لاسکی۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس وقت مولانا محمد حسنی کی عمر صرف ۲۰؍سال تھی۔ کچھ سال بعد انھوں نے ۱۹۶۳ء میں اردو مجلہ ''تعمیر حیات'' بھی جاری کیا۔ وہ ان علمی سرگرمیوں کے ساتھ اصلاح باطن کی طرف بھی پوری طرح متوجہ تھے۔ عارف باللہ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت وارادت کا تعلق تھا۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنے بھتیجے (مولانا سید محمد حسنی) کی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کئی جگہ یہ بات لکھی ہے کہ اُن کی تحریریں سلاست وروانی اور جوش وجذبے میں مجھ سے بڑھی ہوئی ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''ان کا ذہنی وادبی ارتقاء تیزی کے ساتھ جاری رہا۔ عمر ومطالعے کے ساتھ اور جو حالات مشرق وسطیٰ میں پیش آرہے تھے، ان کے اثر سے ان کے قلم کی روانی اوراس سے بڑھ کران کے قلم کی طاقت اور جوش تحریر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ سچی بات یہ ہے کہ وہ اس میں مجھ سے بازی لے گئے۔''(۱)

مولانا محمد منظور نعمانی (بانی مدیر ماہ نامہ الفرقان، لکھنؤ) نے اُن کو اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی قرار دیتے ہوئے ''الفرقان'' کے تعزیتی نوٹ میں لکھا تھا:

---

(۱) تذکرہ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، ص ۹۶

''رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے اکلوتے بھتیجے اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شہرہ آفاق عربی جریدے ''البعث الاسلامی'' کے مدیر مولانا محمد الحسنی، جو اپنی بعض خداداد خصوصیات اور وہبی کمالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھے اور جن کی عمر ابھی صرف ۴۴ رسال کی تھی، صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہماری اس دنیا سے اٹھا لیے گئے۔''(۱)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (سابق جج شریعہ بنچ سپریم کورٹ، پاکستان) نے ان کی وفات پر لکھا تھا:

''مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ ان نوجوان اہل علم اور اہل قلم میں سے تھے جن کا تصور کر کے اپنے زمانے کی مفلسی کا احساس کم ہوتا تھا۔ وہ اگرچہ نوجوان تھے لیکن ان کی فاضلانہ تحریروں نے دین کی وہ خدمت انجام دی ہے، جو بہت سے عمر رسیدہ افراد کے لیے بھی قابل رشک ہے۔''(۲)

مولانا سید محمد حسنی کی پختہ فکر، ایمانی جذبے اور قلمی صلاحیتوں کے اعتراف میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اِن کلمات کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی:

''شاید بہت سے لوگوں پر یہ بات گراں گزرے اور کچھ پڑھنے والے اس کو مبالغہ اور جانب داری پر محمول کریں کہ وہ اپنے اس جوشِ تحریر و زورِ قلم میں سید قطب شہید سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعجب نہیں کہیں (ایک عجمی نژاد نوعمر اور ایک عربی الاصل پختہ کار ادیب کا فرق ذہن میں رکھتے ہوئے) اُن سے بڑھ جاتے ہوں۔''(۳)

عربی زبان میں الإسلام الممتحن، مع الحقیقة، أضواء علیٰ الطریق، الإسلام بین لا و نعم، المنهج الإسلامی السلیم اور اردو میں سیرت مولانا محمد علی مونگیری، تذکرہ شاہ علم اللہ حسنی، قرآن آپ سے مخاطب ہے، روداد چمن اور جادۂ فکر و عمل

---

(۱) ماہ نامہ الفرقان، شمارہ جولائی ۱۹۷۹ء

(۲) نقوش رفتگاں، ص ۱۳۲

(۳) تذکرہ ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی، ص ۱۱۶

اُن کی علمی یادگاریں ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے کئی اہم کتابوں کو عربی سے اردو اور اردو سے عربی زبان میں بھی منتقل کیا۔

دادا

مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی کے دادا مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (ولادت: یکم دسمبر ۱۸۹۳ء، وفات: ۷/مئی ۱۹۶۱ء) تھے، جو علامہ حکیم سید عبدالحیٔ حسنی کے بڑے صاحب زادے اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بڑے بھائی اور مربی تھے۔انہوں نے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند سے دینی علوم حاصل کیے اور اس کے بعد کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی تھی۔۱۹۲۳ء میں اپنے والد علامہ عبدالحیٔ حسنی کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی منتخب ہوئے۔اس کے تقریباً آٹھ سال بعد ۱۹۳۱ء میں ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے اور تادم آخر یہ ذمے داری نبھائی۔یعنی کُل تیس سال ندوۃ العلماء کے ناظم رہے۔

ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ظاہر و باطن کی متعدد صفاتِ عالیہ عطا فرمائی تھیں۔ وہ ایک طرف شریعت اسلامیہ کا گہرا علم رکھتے تھے تو دوسری طرف ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی تھے۔انہوں نے ایک طرف مشاہیر ندوہ سے کسب فیض کیا تھا تو دوسری طرف شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (ولادت: ۱۸۵۱ء، وفات: ۱۹۲۰ء) اور محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری (ولادت ۱۸۷۵ء، وفات: ۱۹۳۳ء) کے خصوصی فیض یافتہ بھی تھے۔ایک طرف تعلیم و تربیت کا مجتہدانہ ذوق رکھتے تھے تو دوسری طرف اپنے دور کے اصحاب تزکیہ و سلوک سے مسلسل استفادہ بھی کرتے رہتے تھے۔ایک طرف ندوۃ العلماء کے ناظم اور دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ تھے تو دوسری طرف راہِ سلوک میں اپنے عظیم والد کے خلیفہ و جانشین (اور ایک روایت کے مطابق مولانا حسین احمد مدنی کے خلیفۂ مجاز) بھی تھے۔اللہ تعالیٰ نے ظاہری طور پر بھی بہت حسن عطا فرمایا تھا۔گویا باطنی نور چھلک کر ظاہر کو بھی پرنور کر رہا تھا۔ان کے عہد کے اکثر علماء، صلحاء اور قائدین ان کے علم و عمل اور صالحیت و نجابت کے معترف تھے۔

جن میں حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی (ولادت:۱۸۶۳م، وفات:۱۹۴۳م)، عارف باللہ مولانا عبدالقادر رائے پوری (ولادت:۱۲۹۵ھ، وفات:۱۳۸۲ھ)، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی (ولادت: ۱۸۷۹م، وفات:۱۹۵۷م) اور امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ بانی جماعت تبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلوی (ولادت: ۱۸۸۵م، وفات:۱۹۶۵م) نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کو رخصت کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا، جس سے اُن کے دل میں ڈاکٹر صاحب کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

ہائے افسوس کہ ایک لمحے میں دوست کی ملاقات ختم ہوگئی، ابھی پھول کے دیدار سے سیری بھی نہیں ہوئی تھی کہ موسم بہار چلا گیا۔

متکلم اسلام علامہ عبدالباری ندوی (سابق پروفیسر عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد و خلیفۂ مجاز حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی) نے ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد ''إن هذا إلا ملک کریم'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون کا آغاز اس طرح کیا تھا:

''کسی انسان کو جب پوری سچائی کے ساتھ فرشتہ یا فرشتہ صفت کہا جاتا ہے تو مطلب اس کی نیکی و معصومیت کا مبالغے کے ساتھ اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ کہنے والا خود اس کی کچھ نہ کچھ بشری کم زوریوں کو جانتا ہے۔ مگر اس کی معصومانہ فرشتہ صفتی کے مقابلے میں وہ نظر انداز کرنے کے قابل ہوتی ہیں اور کہنے والا جھوٹا نہیں خیال کیا جاتا ہے۔ بل کہ ایسا مبالغہ حقیقت واقعہ کو کما حقہٗ ظاہر کرنے کا ایک بلیغ عنوان ہوتا ہے۔ لیکن یہاں مدت العمر کے قریب سے قریب تجربات پر مبنی ایک ایسی ملکوتی ذات کا کچھ ذکر کرنا مقصود ہے، جس کی نسبت بلا مبالغہ اور بلاتشبیہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ''إن هذا إلا ملک کریم'' کے سوا کچھ کہا جائے۔ مراد حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء کی شخصیت

ہے۔نوّر اللّٰہ مرقدہ ورفع درجاتہ۔"(۱)

معروف عالم دین، تاریخ نگار اور انشاء پرداز مولانا سید مناظر احسن گیلانی (ولادت:۱۸۹۲م، وفات:۱۹۵۶م) کئی ماہ تک ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج رہے۔ یہ علاج علامہ عبدالباری ندوی کے مشورے سے ہوا تھا۔ اس سے پہلے مولانا گیلانی کی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہ تھی۔ چناں چہ پہلی مرتبہ جب علامہ عبدالباری انہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے تو واپسی میں انہوں نے اپنے تأثر کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے ایک ایسے آدمی کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا، جیسا نہ اب تک ان آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ امید ہے کہ دوسرا دیکھنے میں آئے گا۔ میرا دل تو پورے یقین و وثوق سے کہتا ہے کہ اس شخص کے قلب پر کسی معصیت کا خطرہ بھی نہیں گزرتا۔"(۲)

ڈاکٹر صاحب کے متعلق مذکور بالا دونوں عالی شہادتوں کو صرف شہادت کے طور پر نہیں بل کہ "معاصرین کی شہادت" کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ معاصرین بھی کوئی عام انسان نہیں بل کہ دنیائے علم و تحقیق کے آفتاب و ماہ تاب۔

پردادا

علامہ حکیم سید عبدالحئی حسنی (ولادت:۲۲/دسمبر ۱۸۶۹م، وفات:۲/فروری ۱۹۲۳م) مولانا عبداللہ حسنی کے پردادا تھے۔ وہ ایک عظیم مؤرخ بھی تھے اور نہایت معتبر عالم دین بھی۔ ایک ثقہ محدث بھی تھے اور طبیب حاذق بھی۔ ندوۃ العلماء کے ابتدائی دور ہی سے بانی ندوہ امام سید محمد علی مونگیری، کے دست راست اور معاون ناظم رہے۔ ۱۹۱۵م میں ناظم منتخب ہوئے اور زندگی کے آخری دن تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ندوے کی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ فضل رحماں گنج مرادآبادی (ولادت:۱۲۰۸ھ، وفات:۱۳۱۳ھ) کے مسترشد اور منظور نظر بھی تھے۔ وہ ایک طرف حضرت

(۱) فرشتہ صفت انسان از مولانا عبدالباری ندوی، ص ۴۸

(۲) فرشتہ صفت انسان از مولانا عبدالباری ندوی، ص ۴۹

شاہ ضیاء النبی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حکیم سید فخر الدین خیالی رحمہم اللہ کے خلیفہ تھے تو دوسری طرف عربی ادب میں علامہ سید سلیمان ندوی (ولادت: ۱۸۸۴ء، وفات: ۱۹۵۳ء) جیسے رجل عظیم کے استاد بھی تھے۔ ان کی علمی خدمات کا احاطہ کسی مختصر مضمون میں نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص کو ہندستانی مسلمانوں کی علمی، دینی اور ثقافتی تاریخ سے دل چسپی ہو، وہ مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس میدان میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اسلامی ہندستان کے پورے ہزار سالہ عہد میں شعراء و مشائخ اور سلاطین کے سیکڑوں تذکرے اور تاریخیں لکھی گئیں، لیکن آزاد بلگرامی کی تصنیفات کو چھوڑ کر کوئی مختصر سا رسالہ بھی مستقل یہاں کے علماء و فضلائے فن کے حالات میں نہیں لکھا گیا۔ مولانا مرحوم نے اس نقص کو محسوس کیا اور پورے بیس برس اس کام پر انہوں نے صرف کیے۔ اس عرصے میں ہندستان کی اِس سرحد سے اُس سرحد تک کوئی کتب خانہ نہیں چھوڑا جہاں ان کو ذوق طلب کھینچ کر نہ لے گیا ہو اور بالآخر تقریباً آٹھ دس جلدوں میں علماء ہند کی پوری سوانح عمریاں جمع کیں۔ اس کا مقدمہ لکھا، جس میں ہندستان کے اسلامی علوم و فنون کی تاریخ مرتب کی۔ عربی میں ہندستان کی اسلامی تاریخ کا ایک صفحہ بھی نہیں۔ جو کچھ معلوم ہے وہ انگریزی کی زبانی۔ مرحوم نے ہندستان کی اسلامی تاریخ، سلاطین اسلام، یہاں کے اسلامی تمدن مساجد، مدارس، عمارات، شفاخانے اور دیگر خصوصیات پر ایک پوری کتاب تیار کی۔''(۱)

اسی طرح جو شخص تحریک ندوہ کے آغاز اور تاریخ سے واقف ہوگا وہ بھی حکیم صاحب کے شخصی فضائل اور عظیم خدمات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ندوے کے ابتدائی زمانے میں ذمے داروں کے درمیان بعض امور پر جو اختلاف و انتشار پیدا ہوا، اس

---

(۱) یادِ رفتگاں، ص ۴۸، ۴۹

میں بعض کم فہم بل کہ کج فہم علامہ شبلی نعمانی (ولادت: ۱۸۵۷ء، وفات: ۱۹۱۴ء) اور علامہ عبدالحیٔ حسنی کو ایک دوسرے کا دشمن سمجھنے لگتے ہیں اور نظریاتی وفکری اختلاف کو ذاتی عناد کا رنگ دیتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی نعمانی کے معتبر ترین شاگرد اور عاشق زار تھے۔ اس کے باوجود علامہ عبدالحیٔ حسنی کی وفات پر لکھتے ہیں:

> "ندوہ پر کیا کیا انقلابات آئے۔ کتنے ارکان بدلے۔ کتنے منتظمین آئے اور کتنے بدلے۔ کتنے معتمد اور ناظم عزل ونصب ہوئے۔ کتنے فتنے اور حوادث پیدا ہوئے۔ مگر ان تمام حالات وحوادث کے طوفان میں ثبات واستقلال کی صرف ایک چٹان تھی، جو اپنی جگہ پر تھی اور وہ مولانا سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم کی ذات تھی۔"(۱)

چوں کہ حکیم صاحب خالص علمی ذوق رکھتے تھے اس لیے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف سے ہمیشہ رشتہ جوڑے رکھا۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں سے کئی کتابیں ایسی ہیں، جن کی نظیر پیش کرنے سے علمی دنیا آج تک قاصر ہے۔ ان کی تصانیف میں سے عربی زبان میں نزهة الخواطر، الهند في العهد الإسلامي، الثقافة الإسلامية في الهند، تهذيب الأخلاق اور اردو زبان میں گل رعنا، یادِ ایام، حدیث نبوی اور دہلی اور اس کے اطراف خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

یہ مولانا کے والد، دادا اور پردادا کے مقام ومرتبے کی بہت ادنیٰ سی جھلک ہے، جس سے اُن کی نسبی کرامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان بزرگوں کے یہ مختصر حالات یہ سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ مولانا عبداللہ حسنی کی شخصیت پر" کریم ابن کریم ابن کریم" کی تعبیر پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہاں ان کی خاندانی نجابت کا تذکرہ برائے تذکرہ نہیں ہے، بل کہ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مولانا کو اپنے آباء کی امتیازی خصوصیات اور اوصاف وکمالات کا بڑا حصہ ورثے میں ملا تھا۔ ہمیں ان کے ہاں ان کے پردادا علامہ حکیم سید عبدالحیٔ حسنی کی علم حدیث سے بے انتہا دل چسپی اور کامل اتباع سنت، دادا مولانا

(۱) یادِ رفتگاں، ص ۴۸

ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کا انداز تربیت، وسعت فکر اور دعوت اسلامی کا شوق اور والد مولانا سید محمد حسنی کی اسلامی حمیت اور ایمانی جوش وولولہ پورے طور پر نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ دو ایسی نمایاں صفات، جو ان تینوں بزرگوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں، وہ بھی مولانا کی شخصیت میں بہ درجۂ اتم موجود تھیں۔ایک: اصلاح نفس کا شوق اور صالحین سے گہرا ربط و تعلق۔دوم: یکسوئی اور اپنی دینی سرگرمیوں کا حتیٰ الامکان اخفاء۔

ولادت

علامہ حکیم سید عبدالحئی حسنی نے دو نکاح کیے تھے۔پہلی بیوی (سیدہ زینب بنت مولانا سید عبدالعزیز ہنسوی) کی تنہا اولاد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندوی تھے۔ جب کہ دوسری بیوی (سیدہ خیر النساء بہتر بنت شاہ ضیاء النبی) سے سب سے پہلے محترمہ سیدہ امۃ العزیز حسنی (والدہ ماجدہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی)، دوسرے نمبر پر محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم حسنی اور سب سے آخر میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی پیدا ہوئے۔حکیم صاحب کے ان دو صاحب زادوں میں سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جب کہ ڈاکٹر عبدالعلی حسنی کو اللہ تعالیٰ نے مسلسل پانچ بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا (مولانا سید محمد حسنی) عطا فرمایا۔ مولانا محمد الحسنی کا نکاح ڈاکٹر سید حسن مثنیٰ حسنی کی صاحب زادی محترمہ سیدہ زکیہ حسنی سے ہوا، جن سے اللہ تعالیٰ نے تین بیٹے عطا فرمائے۔ان میں سب سے بڑے داعیِ اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی تھے، جو ۲۹/جنوری ۱۹۵۷ء کو پیدا ہوئے۔

ماحول

یہ وہ وقت تھا جب انسانوں کی اس دنیا میں حیوانی طاقتوں اور شیطانی نظریات کی کش مکش دو عالمی جنگوں کی شکل میں ظاہر ہو کر لاکھوں انسانوں کی بربادی کا سبب بن چکی تھی۔مشرق وسطیٰ میں ناجائز صہیونی ریاست اسرائیل وجود میں آگئی تھی اور سرزمین مقدس فلسطین اور قبلۂ اول مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔صہیونی ریاست اپنی پے در پے

کام یابیوں کے نتیجے میں تیزی کے ساتھ عالم اسلام کو اپنی گرفت میں لینے کی کوششیں کر رہی تھی اور مصر سے صحراء سیناء چھین چکی تھی۔ ان مایوسیوں کے ماحول میں اللہ تعالیٰ تحریک اخوان المسلمین کی شکل میں امید کی ایک روشن کرن پیدا کر چکا تھا۔ یہ تحریک اپنے انقلابی نتائج کی وجہ سے ظالم طاقتوں کے لیے خطرے کی گھنٹی بن گئی تھی اور سخت آزمائشی دور سے گزر رہی تھی۔ اس کے بانی امام حسن البناء (ولادت: ۱۹۰۶م، وفات: ۱۹۴۹م) جام شہادت نوش کر چکے تھے اور تحریک کے دوسرے قائدین حکومتی مظالم کا شکار تھے۔

ہندستان کی تقسیم کو دس برس بیت چکے تھے۔ دونوں طرف سیاسی و معاشرتی عدم استحکام کی کیفیت تھی۔ تقسیم کا واقعہ مسلمانان ہند کے لیے کئی ناحیوں سے واقعے کے بہ جائے ''حادثے'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ مسلمانوں کو زبوں حالی سے نکالنے کے لیے ایک طرف مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی اصلاحی تحریک زور شور سے جاری تھی تو دوسری طرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (ولادت: ۱۹۰۳م، وفات: ۱۹۷۹م) جماعت اسلامی کا آغاز کر کے پاکستان کو اپنا مستقر بنا چکے تھے اور ہندستان میں ندوۃ العلماء ہی کے ایک مایہ ناز فرزند مولانا ابواللیث ندوی (ولادت: ۱۹۱۴م، وفات: ۱۹۹۰م) جماعت کی نشأۃ ثانیہ انجام دے رہے تھے۔ ملک میں موجود فرقہ پرست طاقتیں گاندھی جی کے قتل کے بعد ہر شعبے میں فرقہ پرستی اور نفرت کا زہر گھول رہی تھیں اور مسلمانان ہند اپنے ہی وطن میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگے تھے۔

تحریک ندوۃ العلماء اپنے قیام کے ساٹھ برس مکمل کر لینے اور اپنی فکری آفاقیت اور ولی اللہی اعتدال کے باوجود بعض حلقوں کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا کر رہی تھی۔ افراد خاندان میں ایک طرف ان کے دادا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندوۃ العلماء کے ناظم تھے اور تقسیم ہند کی وجہ سے پیش آنے والے سخت حالات میں تحریک ندوۃ کے استحکام کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ان کے چھوٹے دادا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شہرت برصغیر کی حدود پار کر کے عالم عرب تک پہنچ چکی تھی اور ان کی کئی اہم تصانیف عرب و عجم میں مقبول ہو چکی تھیں۔ خود ان کے والد محترم مولانا سید محمد حسنی ''البعث الاسلامی''

کا اجراء کر چکے تھے اور اپنی تمام تر قلمی صلاحیتوں کو باطل افکار کے مقابلے اور رجوع الی الاسلام کی پرزور دعوت میں صرف کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ان کے دو چچا مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صحافت کے ساتھ تدریس کے میدان میں بھی ندوے کے لیے اپنی صلاحیتیں اور زندگیاں وقف کر چکے تھے۔ گویا مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں، وہ دور عالم اسلام اور خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اضطراب، بے چینی اور سخت آزمائشوں کا دور تھا۔ لیکن مسلمانوں پر طاری حزن و ملال کی کیفیت کے ساتھ اس دور میں متعدد عالمی اسلامی تحریکیں اپنے عہد طفولت سے نکل کر جوانی کے دور میں داخل ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی ان کے خاندان کے کئی افراد کسی مایوسی کا شکار ہوئے بغیر پوری یک سوئی کے ساتھ دفاع اسلام اور دعوت اسلام کا فریضہ انجام دے رہے تھے اور پورے اعتدال و توازن کے ساتھ تعمیری کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت پر ان حالات کا اثر ہونا ایک فطری بات تھی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ آگے چل کر عالم اسلام کو پیش آنے والے حالات پر تڑپنا اور بے چین رہنا اور خاموشی کے ساتھ امت کی نشأۃ ثانیہ کی جدوجہد میں لگے رہنا اُن کی امتیازی خصوصیت بن گئی تھی۔

بچپن

مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی کا بچپن بھی جوانی کی طرح بزرگوں کے زیر سایہ اور نہایت سعادت مندی کے ساتھ گزرا۔ ان کی ولادت کے کچھ عرصے بعد مولانا حسین احمد مدنی لکھنؤ تشریف لے گئے اور معمول کے مطابق ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے مکان پر قیام کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس نور نظر اور پہلے پوتے کو مولانا کی خدمت میں پیش کیا اور سنتِ تحنیک ادا کرائی۔

مولانا عبداللہ حسنی کی ایک بڑی خوش نصیبی یہ بھی رہی کہ انہیں اپنے بچپن کے چار سال اپنے دادا مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی جیسے عالم ربانی اور فرشتہ صفت مومن کامل کے سائے میں گزارنے کا موقع ملا۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب برصغیر کے عرف عام کے لحاظ سے

بزرگ یا ولی نہ تھے، لیکن قرآن وحدیث کے اعتبار سے ان کے بزرگ یا ولی ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ ایسی جلیل القدر شخصیت کی سرپرستی اور بے پناہ شفقت کے سائے میں بچپن گزارنا یقیناً بڑی سعادت کی بات ہے۔ کم سنی کے باوجود مولانا اپنے دادا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی سے بہت لگے ہوئے تھے۔ ہر چیز میں اُن کی نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ ساتھ میں مسجد جاتے۔ آرام کے اوقات میں بھی اُن کے پاس پہنچ جاتے۔ ساتھ لیٹ جاتے اور مزے مزے کی باتیں کرتے رہتے۔ بے تکلف اُن کے پاس سو جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطب جانے کا وقت ہوتا تو جلدی سے اُن کے کمرے میں جا کر جوتے صاف کرنے لگتے۔ ننھے بچے کی پیاری پیاری باتوں اور معصومانہ حرکتوں میں ڈاکٹر صاحب کے لیے فرحت وانبساط کا بڑا سامان ہوتا تھا۔ چناں چہ وہ خوش ہو کر کبھی کبھی یہ بھی فرماتے کہ "یہ میرا اتالیق ہے"۔

تعلیمی زندگی

چار برس اپنے عظیم دادا کی غیر محسوس درس گاہ میں گزار لینے کے بعد اب وقت آ گیا تھا کہ مولانا باقاعدہ کسی استاد یا ادارے سے استفادہ کریں۔ اتفاق کی بات یہ کہ اسی درمیان ان کے دادا بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ گویا ارادۂ الٰہی کے مطابق انھوں نے اپنے دل کے ٹکڑے، آنکھوں کی ٹھنڈک اور پہلے پوتے کی تعلیمی وتربیتی عمارت کی خشت اوّل اپنے دست مبارک سے رکھی اور چلے گئے۔

یہاں تعلیم وتربیت کے ایک بنیادی نکتے کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ کہ انسان کے مزاج اور ذوق پر ان ایام کا بے انتہا اثر پڑتا ہے، جن ایام کو عام طور پر غفلت اور ناسمجھی کا وقت تصور کیا جاتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے ابتدائی چار پانچ برسوں کے بعد تعلیم حاصل کرنا شروع کرتا ہے۔ اس سے پہلے وہ تعلیمی اداروں کے لائق نہیں ہوتا۔ لیکن ان چار پانچ برسوں میں اس کے گرد وپیش میں واقع ہونے والی چیزیں غیر محسوس طریقے سے اس کے مزاج وطبیعت اور ذہنی وفکری ساخت کی سمت متعین کر دیتی ہیں۔ اپنے آس پاس وہ جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے وہ سب کچھ اس کی شخصیت اور ذہنیت کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ماں کی

گود میں لیٹ کر غنودگی کے عالم میں سننے والی لوریاں بھی اس کی تربیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔اس ناچیز سے دیکھا جائے تو مولانا عبداللہ حسنی ندوی اپنے دادا کی پاکیزہ تربیت میں چار سالہ زندگی گزار کر سعادت مندوں اور نیک بختوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا چکے تھے۔ باقاعدہ تعلیمی سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہی ان کا مزاج اور ذہن اپنے دادا کی نجابت وشرافت کے اثرات قبول کر چکا تھا۔اپنے اس دعوے کے ثبوت کے طور پر ہم مولانا کی دعوتی سرگرمیوں اور دعوت اسلام کے جذبے کو پیش کر سکتے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ خانوادۂ علم اللہی میں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی غیر مسلموں کے درمیان دعوت حق کی فکر میں بہت ممتاز تھے۔ انھیں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ ہندستان میں بسنے والے لاکھوں کروڑوں غیر مسلموں کے لیے جہنم کے ابدی عذاب کا فیصلہ سنا کر خاموش رہنا اعلیٰ درجے کی نادانی اور بے وقوفی ہوگی۔اسی جذبے کے تحت انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو مختلف ہدایات بھی دیں اور انھیں ہندستان کے آئین ساز بھیم راؤ امبیڈکر (آمد:۱۸۹۱م، رخصت:۱۹۵۶م) کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے بمبئی بھی بھیجا۔اسی جذبے کے تحت انھوں نے مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی تحریک کے لیے ندوۃ العلماء کے دروازے بھی کھولے تھے۔ تاکہ طلبہ آس پاس کے علاقوں میں جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کریں اور جب ندوے سے فارغ ہوں تو دعوت اسلام کے لیے بھی تیار ہو چکے ہوں۔ایک طرف جذبۂ دعوت میں ڈاکٹر صاحب اپنے خاندان میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں تو دوسری طرف مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کے متعلق یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے خاندان میں غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے میں سب سے نمایاں اور منفرد مقام پر فائز ہیں۔ان دونوں باتوں کو جوڑ کر اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس فکر اور پاکیزہ جذبے کا اثر غیر شعوری طور پر ان کے ننھے پوتے میں منتقل ہوا، تو یہ ہرگز غلط نہ ہوگا۔

۱۹۶۱م میں انھیں ابتدائی تعلیم کے لیے مولوی محمد سلیم صاحب کے سپرد کیا گیا۔

مولوی محمد سلیم صاحب خانوادۂ علم اللہی کے متعدد افراد کے استاد تھے۔ مولانا عبداللہ حسنی کے والد محترم مولانا محمد الحسنی نے بھی ان سے پڑھا تھا۔ کسی ایک شخص پر اتنا اعتماد ہونا کہ وہ ''پشتینی استاذ'' بن جائے، انتہائی خلوص وشرافت کی دلیل ہے۔ مولوی محمد سلیم صاحب نے مولانا کو قاعدہ اور اس کے بعد قرآن ناظرہ پڑھانا شروع کیا۔ قرآن مجید مکمل کر لینے کے بعد انھوں نے قریب کے ایک مکتب میں بھی تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی (سکریٹری شعبۂ دعوت وارشاد، ندوۃ العلماء لکھنؤ) سے بھی پڑھا۔ اس ابتدائی تعلیم میں تقریباً چار برس لگے۔ اس کے بعد مولانا کو ۱۹۶۶ء میں معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب ندوۃ العلماء کی مسند نظامت پر مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی فائز تھے اور اپنے برادر معظم کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کے قافلہ سالار بنے تھے۔ ندوۃ العلماء میں مولانا کا تعلیمی سفر جاری رہا اور ۱۹۷۵ء میں انھوں نے عالمیت کی سند حاصل کی۔ اسی سال ندوے کا پچاسی سالہ جشن بھی منایا گیا۔ جشن کیا تھا عالم اسلام کی تقریباً تمام مقتدر شخصیات کا اجتماع تھا۔ ندوے کے ناظم کی حیثیت سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس عظیم الشان بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس کے داعی اور روح رواں تھے۔ مولانا عبداللہ حسنی نے ندوے کے ایک فرزند کی حیثیت سے اس کانفرنس میں اپنا حتی الامکان تعاون پیش کیا۔ اس اجلاس کی روداد مولانا کے والد محترم مولانا سید محمد حسنی کے قلم سے ''روداد چمن'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے علم حدیث سے مناسبت کی بنا پر حدیث میں فضیلت کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیخ الحدیث مولانا عبدالستار اعظمی سے صحیح بخاری، مولانا ضیاء الحسن اعظمی سے سنن ابی داؤد، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) سے فقہ اسلامی، مولانا برہان الدین سنبھلی (شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء، ونائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) سے تفسیر اور مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدیر البعث الاسلامی لکھنؤ) اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، وسکریٹری عالمی رابطۂ ادب اسلامی شاخ برصغیر وممالک شرقیہ) سے عربی زبان وادب کی تعلیم

حاصل کی۔ اس وقت مولانا محمد منظور نعمانی باحیات تھے اور ماہ نامہ الفرقان کے ذریعے ہندستانی مسلمانوں کی تربیت انجام دے رہے تھے۔ مولانا منظور نعمانی کے خانوادۂ علم الٰہی سے بھی گہرے روابط تھے۔ چناں چہ مولانا عبداللہ حسنی نے ان سے بھی ذاتی طور پر استفادہ کرنے کا عزم کیا۔ مولانا نعمانی کی حدیث فہمی کے ثبوت کے لیے صرف معارف الحدیث ہی کافی ہے۔ لیکن چوں کہ درس وتدریس ان کا مشغلہ نہ تھا اس لیے مولانا عبداللہ صاحب نے ان سے استفادے کی یہ شکل نکالی کہ وہ اپنے دو رفقاء کے ساتھ مولانا کے گھر پر حاضری دیں اور صحیح بخاری پڑھیں۔ مولانا نعمانی نے ان کی درخواست قبول کی اور ان تینوں کو بخاری پڑھانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ تینوں طلبہ کے ذمے بخاری کی ایک ایک شرح کا مطالعہ تھا۔ مولانا عبداللہ حسنی کے حصے میں شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی کی "عمدۃ القاری" آئی۔ مولانا پابندی کے ساتھ پورے ذوق وشوق سے اس کا مطالعہ کر کے جاتے اور مولانا محمد منظور نعمانی سے استفادہ کرتے۔ لیکن یہ سلسلہ دو تین ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ ابھی مولانا نے ندوے سے سند فراغ حاصل نہیں کی تھی کہ ندوے میں بیسویں صدی کے جلیل القدر محدث علامہ عبدالفتاح ابوغدہ تشریف لائے۔ آخری درجات کے طلباء کے ساتھ ساتھ مولانا نے بھی علامہ سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کی شخصیت ومحبت کا بہت زیادہ تاثر لیا۔ شیخ ابوغدہ نے ندوے میں جن لوگوں کو اپنی جانب سے اجازت حدیث عطا فرمائی تھی ان میں مولانا بھی شامل تھے۔ اسی طرح ۱۹۷۷ء میں مولانا نے ندوۃ العلماء سے علم دین کی تعلیم مکمل کر لی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال تھی۔ ندوے میں تعلیم کے دوران ہی مولانا نے خاموشی کے ساتھ برصغیر میں علم تجوید وقرأت کے اہم مرکز مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ سے قرأت وتجوید کی بھی تکمیل کر لی اور سند قرأت اور دستارِ فراغت سے سرفراز ہوئے۔ اُن کے اس اقدام پر مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار فرمایا۔ کیوں کہ مولانا اپنے خاندان کے پہلے سند یافتہ قاری ومجود بنے تھے۔

مولانا عبداللہ حسنی کی پوری تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہی ہوئی۔ جس

گھرانے میں انھوں نے آنکھیں کھولیں، وہ گھرانہ بھی تین پشتوں سے ندوے سے وابستہ تھا۔ جس عظیم باپ کے گھر میں وہ پیدا ہوئے، وہ پورے عالم اسلام کے لیے تحریک ندوہ کا بہترین ترجمان تھا۔ جس دادا کی گود میں کھیلتے کودتے ہوئے انھوں نے اپنی زندگی کے چار سال گزارے تھے، وہ تین دہائیوں تک ناظم ندوہ کی حیثیت سے ندوے کا خدمت گار تھا۔ جن چچاؤں کی نظرِ عنایت مستقل ان پر تھی، وہ سب اپنی تمام تر صلاحیتیں ندوے کے لیے وقف کر چکے تھے۔ اپنے دادا اور باپ کے بعد وہ جس شخصیت کی سرپرستی اور تربیت میں آئے وہ پورے عالم اسلام کے لیے مربی ورہبر کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ صرف مولانا کا مربی اور سرپرست ہی نہیں بل کہ ان کا مرشد روحانی بھی تھا۔ یعنی مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔ یعنی مولانا اول بھی ندوی تھے اور آخر بھی۔ ان کی پیدائش بھی ندوے کے ماحول میں ہوئی اور وفات بھی۔ ندوے کی فکری آفاقیت اور بے مثال اعتدال وتوازن ان کے ذہن ودماغ، زبان وبیان حتیٰ کہ چال ڈھال تک میں سما گیا تھا۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی مکمل تعلیم ہی ندوے کی نہ تھی بل کہ ان کا مزاج اور ذہن وفکر بھی ندویت کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ ندوے کی عالمی فکر ان کے ظاہر وباطن میں رچ بس گئی تھی۔

ایک دل چسپ بات

یہاں ایک بات کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کو تعلیم وتربیت کا اجتہادی ذوق عطا فرمایا تھا۔ وہ کسی بھی زبان کو سیکھنے یا سکھانے کے لیے گرامر سے پہلے الفاظ (Vocabulary) اور عبارت کو ضروری سمجھتے تھے۔ اسی طرح اداروں کی اسنادِ فراغت سے زیادہ استعداد کو لازمی سمجھتے تھے۔ اپنے ان اصولوں کو انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) اور صاحب زادے (مولانا سید محمد حسنی ندوی) کی تعلیم وتربیت کے لیے استعمال کیا اور پوری طرح کام یاب بھی ہوئے۔ ان دونوں حضرات نے نحو وصرف کی بھاری بھرکم کتابیں نہیں پڑھیں، اس کے باوجود عرب ادباء نے بھی ان کی زبان دانی کا لوہا مانا۔ اسی طرح ان دونوں نے شروع سے

آخر تک تعلیمی نظام میں بندھنے کے بہ جائے مختلف علماء سے، مختلف اوقات میں، مختلف کتابیں پڑھیں اور قابل رشک استعداد پیدا کرلی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مولانا عبداللہ حسنی ندوی کے والد محترم مولانا محمد حسنی کی مکمل تعلیم وتربیت اسی انداز سے ہوئی تھی اور اس کے حیرت انگیز نتائج بھی برآمد ہوئے تھے تو انھوں نے اپنی اولاد بالخصوص مولانا عبداللہ صاحب کو اسی انوکھے انداز سے تعلیم کیوں نہیں دی؟ یہ سوال نہ تو منفی انداز کا اعتراض ہے اور نہ اس کا تعلق کسی ایک فرد سے ہے۔ یہ سوال اس لیے اہم اور غور وفکر کا طالب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے انداز تعلیم وتربیت سے واقفیت رکھنے والے عام طور پر ان کے خیالات کی حمایت کرتے ہیں اور ان کے طریقہ تربیت کو مفید سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں خود اُن کے صاحب زادۂ گرامی کا اپنے والد کے اصول تربیت کو اختیار نہ کرنا، اس رجحان کو جنم دیتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کی رائے اپنے والد کی رائے کے مطابق نہ تھی۔ اگر واقعی ایسا ہے تو وہ کیا وجوہ تھیں، جن کی بناء پر وہ اس نظریے کے حامی نہ تھے؟ اس سوال کا تعلق مولانا عبداللہ صاحب کی تعلیم وتربیت سے بہت آگے بڑھ کر نصاب تعلیم اور نظام تربیت کے اصول وضوابط سے ہے۔

اس کے برعکس جب مولانا عبداللہ حسنی کو اپنے دونوں بھائیوں کی تربیت کا موقع ملا تو انھوں نے اپنے دادا کے اصول تربیت کو اختیار کرتے ہوئے ابتداء ہی سے کسی تعلیم گاہ میں داخل نہیں کرایا۔ بل کہ الگ الگ اساتذہ سے مختلف موضوعات کی تعلیم دلوائی اور پھر آگے چل کر ندوے کے تعلیمی نظام میں داخل کرایا۔ گویا مولانا نے اپنے دادا اور مروجہ تعلیمی نظام کے درمیان کی راہ اختیار کی۔

سلسلہ تربیت

۱۹۷۷ء میں مولانا کا تعلیمی سفر تو ختم ہوگیا لیکن تربیتی سفر جاری رہا۔ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ مولانا نے ندوے کے نصاب کے مطابق تعلیم تو مکمل کرلی لیکن ہمیشہ طلب علم اور اپنی اصلاح وتربیت کی فکر میں لگے رہے۔ جن شخصیات سے مولانا نے اصلاح وتربیت

کے سلسلے میں ربط رکھا یا جن کی رہ نمائی میں اپنی ذاتی یا دعوتی زندگی کے مراحل طے کرتے رہے، اُن میں یہ شخصیات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں:

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

۱۹۷۹ء میں اچانک مولانا محمد حسنی کا حادثۂ وفات پیش آ گیا۔ اس وقت ان کے بڑے صاحب زادے مولانا عبداللہ حسنی ندوی کی عمر ۲۲ رسال تھی۔ والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد وہ مکمل طور پر اس شخصیت کے دامن تربیت کے سائے میں آ گئے، جس نے ایک سایہ دار درخت کی طرح پوری امت مسلمہ اور خاص طور پر مسلمانان ہند کو طویل عرصے تک اپنی شفقت و قیادت کی ٹھنڈی چھاؤں میں رکھا۔ یعنی مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (ولادت: ۱۹۱۳ء، وفات: ۱۹۹۹ء)، جو مولانا عبداللہ حسنی کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ اصل علمی و فکری صلاحیتیں تعلیمی دور سے زیادہ تدریسی دور میں پروان چڑھتی ہیں۔ مولانا عبداللہ حسنی کی زندگی کا تعلیمی دور اپنے والد محترم کے زیر سایہ گزرا اور تدریسی دور میں بیس سال سے زیادہ کا عرصہ مولانا ابوالحسن ندوی کے زیر نگرانی۔ تدریسی دور شروع ہوتے ہی وہ مفکر اسلام کے زیر تربیت آ گئے تھے۔ یعنی ان دونوں ادوار میں وہ ایسے لوگوں کی تربیت میں رہے، جن کی وسیع تر خدمات سے ایک جہان مستفید ہو رہا تھا۔ خاص طور پر تدریسی دور، جو دامن بوالحسن کے سائے میں گزرا۔ اس دامن کی وسعت و ہمہ گیری کوئی ڈھکی چھپی شئے نہیں ہے۔ ہر شخص کھلی آنکھوں اس کی عظمت و رفعت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ باپ باپ ہوتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ لیکن مولانا عبداللہ حسنی کے سلسلے میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ والد کی وفات کے بعد ان کی زندگی میں علمی، فکری اور تربیتی لحاظ سے کوئی خلا پیدا نہیں ہوا۔ مولانا کے ہاں جو فکری بلندی، داعیانہ تڑپ اور اعتدال و توازن پایا جاتا ہے، وہ اسی فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ یہ صفات ان کے خاندان کے اکثر بزرگوں میں پائی جاتی ہیں، لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان میں سب سے ممتاز نظر آتے ہیں اور اُن کی یہ صفات

مولانا عبداللہ حسنی ندوی میں بھی منتقل ہوئیں۔ گویا:

ہم کو کیا معلوم کیا ہے رسم و راہِ عاشقی
آپ لے آئے جہاں تک ہم وہاں تک آ گئے

مولانا عبداللہ حسنی کو بچپن ہی سے مفکر اسلام سے حد درجہ محبت اور فطری لگاؤ تھا۔ ان کی نوعمری میں جب ان کے والدین وغیرہ رمضان کے مہینے میں بھی لکھنؤ میں رہتے تھے، اُس وقت بھی مولانا اپنے والد سے اجازت لے کر تکیہ پہنچ جاتے تھے، تاکہ مفکر اسلام کے ساتھ رمضان گزار سکیں۔ دوسری طرف مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان پر بڑی شفقت وعنایت فرماتے تھے۔ افطار میں اپنے ساتھ شریک رکھتے۔ اپنا بچا ہوا کھانا کھلاتے۔ پانی یا کوئی اور مشروب پیتے تو بچا کر ان کو بھی دیتے۔ وہ کسی کام میں مشغول ہوتے تو دیر تک ان پر نظر عنایت فرماتے، جیسے ہی مولانا ان کو دیکھتے تو فوراً توجہ ہٹا لیتے اور دوسرے کام میں مشغول ہو جاتے۔ زندگی کے آخری چند ماہ میں جب معذوری بہت بڑھ گئی تھی اور دوسرے لوگ وضو کراتے تھے، اُس وقت اُن کی خواہش ہوتی تھی کہ پاؤں مولانا عبداللہ صاحب ہی دھلوائیں۔ چناں چہ اس خدمت کی ادائی کے لیے مولانا بھی اسفار وغیرہ سے احتراز کرتے تھے اور یہ شرف حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح آخری وقت میں صحیح بخاری سننے کا ارادہ کیا تو اس مبارک خدمت کے لیے بھی مولانا ہی کو مقرر فرمایا۔ تکیے کی مسجد میں پہلے جمعہ کی اور بعد میں عیدین کی امامت وخطابت بھی مولانا ہی کے سپرد کر دی تھی اور جلسوں میں اپنی جگہ بھی انھیں بھیجنے لگے تھے۔

دنیا کے لیے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی امام زمانہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی زندگی میں مولانا عبداللہ حسنی ندوی کو ان کے محبوب پوتے اور ندوے کے ایک مخلص استاد کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اِن دونوں کا آپسی رشتہ کچھ اور تھا۔ مولانا عبداللہ حسنی کے لیے مولانا ابوالحسن ندوی ایک باپ کی بھی حیثیت رکھتے تھے اور سرپرست و مربی کی بھی۔ وہ ان کے لیے پیر و مرشد بھی تھے اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں رہ نما بھی۔ اسی

طرح مولانا ابوالحسن ندوی کے لیے مولانا عبداللہ حسنی سگی اولاد کے درجے میں بھی تھے اور دعوتی و علمی کاموں میں ان کے معاون بھی۔ ان کی نظر میں مولانا عبداللہ صاحب ندوے کے ایک لائق استاد بھی تھے اور مستقبل کے ہادی و مصلح بھی۔ چناں چہ مولانا عبداللہ حسنی نے مفکر اسلام کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے اور ان کی رہ نمائی میں عربی صحافت کے میدان میں بھی کام یابی کے ساتھ قدم رکھا۔ دعوتی اسفار میں ان کے رفیق سفر بھی رہے اور دور جوانی میں ہی راہِ سلوک کے اعلیٰ منازل طے کر کے ۵/رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو بعد نماز ظہر ان کی خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔ گویا مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جیسے دور اندیش اور مردم شناس انسان نے بہت پہلے ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ ان کے محسن و شفیق بھائی کا یہ جواں سال پوتا اور ان کے پیارے بھتیجے کا یہ فرزند ایک دن ملت اسلامیہ کے لیے اپنی زبان، قلم، جسم، جان، ذہن اور فکر کو پوری طرح امت کی نشأۃ ثانیہ کے لیے استعمال کرے گا اور بے شمار انسانوں کی ہدایت و رہ نمائی کا ذریعہ بنے گا۔

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو اس لیے بھی بے حد لگاؤ اور تعلق تھا کہ انھیں اُن کے اندر اپنے بھتیجے اور مولانا عبداللہ حسنی کے والد مولانا محمد الحسنی کا عکسِ جمیل نظر آتا تھا، جو عین عالم جوانی میں اپنی دائمی مفارقت کا کاری زخم دے گئے تھے۔ اس محبت و تعلق میں یقیناً یہ وجہ بھی شامل ہوگی کہ مولانا اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی حسنی کے بے پناہ احسانات کا کچھ حق ادا کرنا چاہتے ہوں۔ بہ ہر حال وجہ چاہے کچھ بھی ہو جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا چین اور مستقبل میں بے شمار امیدوں کا مرکز تھے۔

مولانا محمد زکریا کاندھلوی

ابھی مولانا عبداللہ حسنی کی عمر دس سال کی تھی کہ وہ مولانا سید ابوالحسن ندوی کے ساتھ معروف مرشد و محدث شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (وفات: ۱۹۸۲ء) کے ہاں

پہنچے۔ مولانا کاندھلوی کے ہاں یہ ان کی پہلی حاضری تھی۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے مولانا ابوالحسن ندوی کی گزارش پر مولانا عبداللہ صاحب کو کم سن ہونے کے باوجود بیعت کرلیا۔ مولانا اس وقت بالغ نہ تھے اور ندوے میں ابتدائی درجات کے طالب علم تھے۔ اس لیے یہ بیعت صرف تبرک کے طور پر تھی۔ اس کے بعد بھی مولانا کو کئی مرتبہ سہارن پور جانے کا موقع ملا۔ مولانا کاندھلوی ہمیشہ ان پر شفقت فرماتے اور توجہات و دعاؤں سے نوازتے۔ اسی درمیان مولانا نے اپنے چچا مولانا سید محمد ثانی حسنی کی کتاب "حیات خلیل" کی تلخیص کی اور اس تلخیص کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ یہ تحریر پہلے ماہ نامہ "البعث الاسلامی" میں شائع ہوئی اور اس کے بعد مستقل کتاب کی شکل میں۔ یہ کتاب مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے مرشد مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی حیات و خدمات پر مشتمل تھی۔ مولانا عبداللہ حسنی نے اس کتاب کی تلخیص و تعریب کر کے مولانا کاندھلوی کے دل میں اپنے لیے مزید جگہ پیدا کرلی۔ البتہ یہ تعلق نہ مزید گہرا ہوسکا اور نہ زیادہ طویل ہوا۔ کیوں کہ مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا قیام مدینہ منورہ میں رہنے لگا تھا اور اسی دوران ۲۴ رمئی ۱۹۸۲م کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی

تقریباً اسی عمر میں انھیں بیسویں صدی کے عظیم مصلح و مرشد بقیۃ السلف مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی (وفات: ۱۹۹۱م) سے قرب و تعلق کا موقع ملا۔ مولانا پرتاپ گڑھی کے نفس گرم اور عشق و مستی میں ڈوبی ہوئی شخصیت سے عقیدت و محبت بل کہ فدائیت کا تعلق رکھنے والوں میں مولانا سید ابوالحسن ندوی اور مولانا محمد حسنی بھی تھے۔ اپنے خاندان کے ان بزرگوں کو دیکھتے ہوئے مولانا عبداللہ حسنی نے بھی مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی کے ہاں کثرت سے جانا شروع کردیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا کے والد محترم مولانا محمد حسنی نے مولانا پرتاپ گڑھی کے عارفانہ کلام کو مرتب کر کے "عرفان محبت" کے نام سے شائع بھی کیا تھا۔ چناں چہ مولانا عبداللہ حسنی نے ان سے بہت فیض حاصل کیا اور ان کی توجہات

وعنایات کے حق دار بنے۔ مولانا پرتاپ گڑھی کو اپنے شیخ حافظِ بخاری مولانا سید بدر علی شاہ سے اجازت بیعت کے ساتھ ساتھ صحیح بخاری کی اجازت بھی حاصل تھی۔

مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی کی سند حدیث اس دور میں "سلسلۃ الذہب" کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح محدثین متفقہ طور پر امام دار الہجرۃ مالک ابن انس کی اس سند کو سلسلۃ الذہب قرار دیتے ہیں، جو حضرت نافع اور حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہم اجمعین) سے ہوتی ہوئی اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچتی ہے، اسی طرح مولانا پرتاپ گڑھی کی سند کو سلسلۃ الذہب ہونے میں عہد حاضر کے مستند اور غیر متعصب علماء و محدثین کو قطعاً اختلاف نہیں ہوسکتا۔ یہ سند امام المحدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ذریعے امام ولی اللہ محدث دہلوی تک پہنچتی ہے اور مولانا پرتاپ گڑھی اور شاہ عبدالعزیز کے درمیان مولانا سید بدر علی شاہ اور اویس زمانہ مولانا شاہ فضل رحماں گنج مراد آبادی جیسی معتبر، مستند اور ثقہ ترین شخصیات ہیں۔ اپنی اس "سلسلۃ الذہب" میں مولانا پرتاپ گڑھی نے مولانا عبداللہ حسنی کو صحیح بخاری کی اجازت سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔

میری نظروں میں اس وقت داعی اسلام مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی کا سراپا گھوم رہا ہے کہ وہ الہ آباد میں مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی کی شاعری پر منعقد ہونے والے عالمی رابطۂ ادب اسلامی (شاخ برصغیر و ممالک شرقیہ) کے اختتامی اجلاس میں عجیب دلبرانہ شان کے ساتھ خطاب فرما رہے ہیں اور مولانا پرتاپ گڑھی کے اشعار پڑھ پڑھ کر ان کی تشریح و توضیح بھی کر رہے ہیں۔ مجمع دم بہ خود ہے۔ جلسہ گاہ میں موجود خواص و عوام سب کی نظریں مولانا پر ٹکی ہوئی ہیں۔ سماعتیں ان کی میٹھی اور باریک آواز سے محظوظ ہو رہی ہیں اور دلوں کی حالت غیر ہوتی جا رہی ہے۔ اسی تقریر میں مولانا نے اپنے ممدوح مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی کی پوری شخصیت کا ایک مختصر سے جملے میں تعارف کراتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ "مولانا تو سراپا عشق و محبت تھے۔" یہ جملہ اور مولانا پرتاپ گڑھی کے اشعار وہ اپنی تقریروں میں بہت کثرت کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ میرا احساس ہے کہ معاصر شخصیات میں وہ اپنے

جد محترم اور مرشد و مربی مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بعد جس شخصیت کا سب سے زیادہ ذکر کرتے تھے وہ بقیۃ السلف مولانا شاہ محمد احمد پرتاپ گڑھی ہی کی ذات گرامی تھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انھیں مولانا پرتاپ گڑھی کی عاشقانہ شخصیت اور عارفانہ تربیت نے بے حد متاثر کیا تھا اور مولانا پرتاپ گڑھی نے ان کی تربیت میں نہایت مؤثر کردار ادا کیا تھا۔

مولانا شاہ ابرار الحق حقی

بیسویں صدی کی دو اور عظیم شخصیات سے ان کا مسترشدانہ تعلق رہا۔ ایک محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق حقی (وفات: ۲۰۰۵م) اور دوسرے عارف باللہ مولانا قاری صدیق احمد باندوی (وفات: ۱۹۹۷م)۔ ان دونوں بزرگوں کی بھی خصوصی توجہات و عنایات مولانا کو حاصل رہیں۔ خود مولانا بھی حتی الامکان اِن دونوں حضرات سے استفادے کی کوشش کرتے رہے۔ بالخصوص مولانا شاہ ابرار الحق حقی سے فیض اٹھانے کے لیے بار بار ہردوئی کا سفر کرتے رہے۔ وقفے وقفے سے اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ ہردوئی حاضری دیں اور کاروان تھانوی کے اس آخری مسافر سے جو کچھ حاصل کر سکتے ہوں کر لیں۔ شاہِ ہردوئی سے اُن کے تعلقات کی ابتداء اُسی دور سے ہوئی تھی، جب وہ مولانا شاہ محمد احمد پرتاپ گڑھی کی خدمت میں الٰہ آباد حاضری دیتے تھے۔ مولانا شاہ ابرار الحق حقی بھی مولانا پرتاپ گڑھی کی خانقاہ میں بہ کثرت تشریف لے جاتے تھے۔ چناں چہ مولانا پرتاپ گڑھی کے بعد مولانا عبداللہ حسنی نے ہردوئی حاضری کو اپنا معمول بنالیا۔

ہم نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے دور میں مولانا عبداللہ حسنی ندوی کو تعلیمی اوقات کے علاوہ ندوے کے احاطے میں شاذ و نادر ہی دیکھا۔ مولانا صبح سویرے اپنی قیام گاہ ''خاتون منزل'' امین آباد سے پیدل ندوہ تشریف لاتے اور چھٹی ہوتے ہی ظہر سے پہلے واپس ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی ظہر کی نماز میں بھی نظر آتے تھے۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری برسوں میں جب مولانا شاہ ابرار الحق حقی بار بار ندوہ تشریف لاتے تھے تو مولانا

عبداللہ حسنی بھی ان سے ملاقات اور حصول فیض کے لیے ضرور ندوے آجاتے تھے۔ خواہ ظہر اور عصر کے بعد کا وقت ہو یا مغرب وعشاء بعد کا۔ مولانا حقی جس وقت بھی ندوے آتے اور جتنی دیر رہتے، مولانا عبداللہ حسنی بھی ان کی صحبت کو لازمی سمجھتے تھے۔

اس تعلق کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کے علوم ومعارف اور انداز تربیت کے بے حد قدرداں تھے۔ مولانا تھانوی کے خطبات، مواعظ، ملفوظات اور تصنیفات وتالیفات کو خود بھی مطالعے میں رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ حکیم الامت کی اصول پسندی اور چٹکیوں میں حکمت واعتدال کے ساتھ بڑے سے بڑا مسئلہ سلجھانے کی ادا انھیں بہت پسند تھی۔ موجودہ دور میں اصلاح وتزکیے کے لیے وہ اصول تھانوی کو سب سے مناسب قرار دیتے تھے۔ صرف پیر تھانہ بھون ہی نہیں بل کہ ان کی شراب طہور سے بلاواسطہ فیض یاب ہونے والے تمام افراد کو وہ نہایت عظمت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خاص طور پر مصلح الامۃ مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی کے حد درجہ معتقد تھے۔ اسی طرح کاروان تھانوی سے وابستہ دوسری نسل کا بھی وہ بہت لحاظ اور اکرام کرتے تھے، جن میں عارف باللہ مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب[1] (خلیفۂ مجاز محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق حقی)، شیخ طریقت مولانا شاہ محمد قمر الزماں الہ آبادی (خلیفۂ مجاز وخویش مصلح الامۃ مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی) اور یادگار ابرار حکیم کلیم اللہ علی گڑھی (جانشین وخویش محی السنہ مولانا شاہ ابرار الحق حقی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اول الذکر دونوں بزرگوں سے مولانا کو بڑی عقیدت تھی اور وہ ان دونوں

---

(۱) افسوس کہ کاروان تھانوی کے تین اہم فرد مولانا شاہ عبدالغنی پھول پوری، ڈاکٹر محمد عبدالحئی عارفی اور مولانا شاہ ابرار الحق حقی سے فیض اٹھا کر ہزاروں افراد کو شریعت مطہرہ کی راہ پر لگانے والا یہ مرشد وقت اور مربی جلیل ۲؍جون ۲۰۱۳ء کو کراچی میں ۹۰ برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ولادت ۱۹۲۴ء میں ضلع پرتاپ گڑھ، اتر پردیش میں ہوئی تھی۔ تصنیفات وتالیفات میں "مواعظ درد محبت" اور "معارف مثنوی" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ ان کے علاوہ آخر الذکر دونوں بزرگ (مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی اور حکیم کلیم اللہ علی گڑھی) الحمدللہ بہ قید حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کا سایہ دراز فرمائے اور ہم سب کو ان سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (اجمل)

کے ملفوظات و مواعظ اپنی مجلسوں میں پڑھوا کر سنوایا بھی کرتے تھے۔ جب کہ آخر الذکر شخصیت سے ملاقات کے لیے وہ علی گڑھ کے سفر بھی کرتے تھے۔

کاروان تھانوی اور ان سے وابستہ افراد سے وابستگی کے نتیجے میں مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی گفتگو اور انداز تربیت میں تھانویت کا رنگ نظر آنے لگا تھا۔ اس رنگ کو ہر وہ شخص بہ آسانی محسوس کر لیتا تھا جو مزاج تھانوی اور علوم تھانوی سے واقفیت رکھتا ہو۔ آج بھی مولانا کی تحریروں، تقریروں یا دروس و ملفوظات میں یہ رنگ بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اتباع سنت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور حکمت و تدبر یقیناً مولانا کو ورثے میں ملا تھا، لیکن اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس رنگ کو گہرا اور خوب گہرا کرنے میں تھانویت سے وابستگی کا بہت اہم کردار رہا ہے۔

مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی

مولانا عبداللہ حسنی پر اپنے تینوں چچاؤں یعنی مولانا سیّد محمد ثانی حسنی، مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سیّد محمد واضح رشید حسنی ندوی کی توجہ اور نظر عنایت ابتداء ہی سے رہی۔ لیکن ۱۹۹۹ء میں مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی کی وفات کے بعد انھیں اپنے چچا اور پورے خانوادۂ علم اللّٰہی کے سرپرست سید العلماء مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی کی توجہات و عنایات خصوصیت کے ساتھ حاصل رہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زندگی میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی خصوصی سرپرستی نہ انھیں حاصل ہوئی اور نہ انھیں اس کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ خود مولانا کے والد محترم مولانا محمد الحسنی اور خاندان کے سرپرست اعلیٰ مولانا سید ابوالحسن ندوی باحیات تھے۔ لہٰذا ایک چچا کا اپنے محبوب بھتیجے سے اور ایک بھتیجے کا اپنے مشفق و محترم چچا سے جو تعلق ہونا چاہیے، وہ ہمیشہ رہا۔ البتہ مفکر اسلام کی رحلت کے بعد اس تعلق میں تربیت و ارادت کا پہلو جڑ گیا، بل کہ دوسرے پہلوؤں پر غالب آ گیا۔ اب مولانا عبداللہ حسنی ندوی کا ہر کام جانشین مفکر اسلام اور قافلہ سالار ملت اسلام مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی مرضی اور سرپرستی میں ہونے لگا۔ مفکر اسلام کی وفات کے

فوراً بعد سے لے کر اپنی حیات کے آخری دن تک مولانا عبداللہ حسنی نے مولانا سیّد محمد رابع حسنی کو اپنا مربی، مزکی، سرپرست اور بڑا تسلیم کیا۔ مولانا سیّد ابوالحسن ندوی سے مولانا عبداللہ حسنی کا تعلق ددیہالی تھا۔ وہ ان کے بڑے بھائی کے پوتے ہونے کے ناطے، ان کے سگے پوتے کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی ان کو اپنی خلافت سے بھی سرفراز فرما چکے تھے اور کئی برسوں سے اپنی جگہ عیدین کی امامت کی ذمے داری بھی تفویض کر چکے تھے۔ ان تمام چیزوں اور قانونی حق کے باوجود مولانا سیّد عبداللہ حسنی ندوی نے مفکر اسلام کی وفات پر فوراً مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو اپنا بڑا تسلیم کیا اور پوری نیازمندی کے ساتھ ان سے نماز جنازہ کی امامت کرنے کی گزارش کی۔ اس دن سے لے کر اپنی زندگی کے آخری دن تک اپنے خانگی یا دعوتی واصلاحی ہر معاملے کا فیصلہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی مرضی کے مطابق ہی کیا۔ کوئی پروگرام درپیش ہوتا تو وہ مولانا سے مشورہ کرتے۔ کسی دعوتی سرگرمی کے متعلق فیصلہ لینا ہوتا تو وہ مولانا سے فیصلہ فرمانے کی گزارش کرتے۔ حتیٰ کہ کسی سفر پر بھی جانا ہوتا تو مولانا کے علم میں لائے بغیر اور ان کی طرف سے سفر کی رضامندی ملے بغیر ہرگز سفر نہ کرتے۔ ایسا بھی ہوا کہ مولانا کسی کام کا ارادہ کرتے بل کہ وہ کسی کام کو کرنا چاہتے لیکن اپنے عم مکرم اور مربی وسرپرست کی رضامندی نہ پاتے تو فوراً اپنی خواہش پر ان کی مرضی کو ترجیح دیتے اور اس کام کو کرنے سے رک جاتے۔

رمضان المبارک کی ۲۷ ریں شب میں قیام لیل کے دوران ختم قرآن کی مناسبت سے مولانا عبداللہ حسنی ندوی کی دعائیں ہم نیازمندوں کو ہمیشہ یاد رہیں گی۔ شب قدر کی مبارک ساعات، تکیہ شاہ علم اللہ کی مقدس فضا، تہجد کی نماز میں ختم قرآن کا مبارک موقع اور مولانا رب کریم کے سامنے دست بہ دعا۔ مسجد میں موجود تمام علماء، طلبہ اور عوام دہاڑیں مار مار کر زار وقطار روتے لیکن مولانا عجیب دلبرانہ شان کے ساتھ تمام آہ وزاریوں سے کٹ کر بارگاہ ایزدی میں اپنے مطالبات پیش کرتے چلے جاتے۔ نہ آواز بھراتی، نہ روتے اور نہ چہرے مہرے سے یہ ظاہر ہونے دیتے کہ ان کا دل اس وقت خدائے

ذوالجلال کے در پر پڑا ہوا آہ و بکا میں مشغول ہے۔لیکن یہ منظر ایک سے زائد مرتبہ دیکھا کہ اپنی طویل دعا میں پورے عالم اسلام، ہندستانی مسلمانوں، محسنوں اور زندوں، مردوں سے گزر کر جیسے ہی اپنے عم مخدوم و محترم اور خسر نام دار مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صحت مندی اور درازیِ عمر کے لیے دعا کرتے ہوئے ان کا نام زبان پر لاتے تو فوراً آواز بھرا جاتی اور وہ سارے جذبات سیل رواں بن کر دنیا کے سامنے آجاتے جو بہت دیر سے کسی طوفان کی شکل میں اندر دبے ہوئے تھے۔مولانا کے لیے اب آگے دعا کرانا مشکل ہو جاتا اور وہ رندھی ہوئی آواز کے ساتھ جلدی جلدی باقی تمام دعائیں کر کے مصلے سے ہٹ جاتے۔

رمضان ہی کے مہینے میں مسجد کے داہنے حصے میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور ان کے برادر گرامی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کے لیے چادریں تان کر اعتکاف کا حجرہ بنایا جاتا اور مسجد کے بائیں حصے میں مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا۔بارہا ایسا ہوا کہ مولانا عبداللہ حسنی کے حجرے میں کوئی صاحب داخل ہوئے اور مصافحہ کر کے بیٹھنے لگے، تو مولانا فوراً دریافت کرتے: ''حضرت سے ملاقات کی؟'' اگر جواب نفی میں ملتا تو ان کے بیٹھنے سے پہلے ہی انھیں روانہ کر دیتے اور فرماتے: ''پہلے مولانا سے مل کر آیئے۔''

اسی طرح مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے تعلق بالقرآن کے سلسلے میں عوام و خواص کی مجرمانہ بے اعتنائی دیکھتے ہوئے تکیے میں سلسلہ وار درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا۔تادم وفات خود درس قرآن دیتے رہے اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اس سلسلے کو بہ طریق احسن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح تقریباً ۳۵ سال سے مولانا عبداللہ حسنی ''تہذیب الاخلاق'' کی روشنی میں درس حدیث کی ذمے داری ادا کرتے رہے۔درس قرآن کے دوران مولانا عبداللہ حسنی خود بھی بالکل خاموش رہتے اور درس سنتے رہتے۔اسی طرح اگر کوئی قریبی درس قرآن کے دوران ملاقات کرنا چاہتا یا کوئی بات کہنا چاہتا تو قدرے ناگواری کے ساتھ اسے خاموش کر کے بٹھا دیتے تھے۔یہ بات بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''جس کو کسی سے محبت ہوتی ہے اور وہ

محبت حد سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی چال ڈھال کے ساتھ اس کی شکل و شباہت میں بھی محبوب و ممدوح کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ مولانا (سید محمد رابع حسنی ندوی) کو دیکھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مولانا (علی میاں) چلے آ رہے ہیں۔ یہ صرف ہمارا احساس نہیں ہے بل کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ سے وابستہ بیش تر افراد کا یہی کہنا ہے۔"

مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی سے والہانہ تعلق اور ان کے غایت درجہ احترام کی گواہی استاد گرامی قدر مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے بھی دی ہے:

> "حدیث شریف میں ہے "لیس منا من لم یوقر کبیرنا و یرحم صغیرنا۔" مولوی عبداللہ حسنی اس پر عامل تھے۔ چھوٹوں پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر اور بڑوں کی تعظیم اور ان کے تجربات سے استفادہ کرنا، اُن کا شعار تھا۔ اس کی ہم گواہی دے سکتے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ گفتگو میں اکرام اور احترام کا معاملہ کرتے تھے۔ باوجود اپنی مقبولیت، محبوبیت اور مشغولیت کے۔ ہم کو اس پر تعجب ہوتا تھا۔ بعض وقت ان کے معتقدین اور مستفیدین کا مجمع ہوتا، وہ ان کو چھوڑ کر ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ کئی مرتبہ ہم نے ان سے کہا کہ لوگ تمہارے انتظار میں ہیں۔ خاص طور پر اتوار کو عصر بعد ان کی خاص مجلس ہوتی۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے۔ اس وقت ہم اور برادر گرامی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب گھر پہنچتے تو وہ سب کو چھوڑ کر گھر میں ہم لوگوں کے پاس آ کر بیٹھے رہتے اور ہم لوگوں کے متوجہ کرنے پر کچھ دیر کے لیے مجلس میں چلے جاتے۔ اُن میں غایت درجے کی تواضع تھی۔ اپنے اساتذہ کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ تھا۔"(۱)

پڑھنے یا سننے میں یہ بات بڑی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی سجی سجائی مجلس چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلے جانا کتنی بڑی بات ہے۔ لوگ تو مجلسیں سجانے کے لیے نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی لوگوں کو جمع نہیں

---

(۱) ماہ نامہ المؤمنات، لکھنؤ، خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا سیّد عبداللہ حسنی ندوی، مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء ص: ۱۰، ۱۱

کرپاتے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ لوگ آرہے ہیں، جمع ہورہے ہیں اور عقیدت واحترام کے ساتھ بیٹھے ہیں اور صاحب مجلس اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ اس نے گھر میں اپنے مربی اور سرپرست کو داخل ہوتے دیکھ لیا ہے۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نہ تو کوئی مہمان تھے اور نہ مہینوں یا برسوں کے بعد گھر میں آتے تھے۔ اس کے باوجود ان کو دیکھ کر مجلس سے اٹھ جانا اور گھر میں مولانا کے پاس جا بیٹھنا مولانا عبداللہ حسنی ندوی کی حد درجہ تواضع اور انکسار کا مظہر بھی ہے اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے لیے ان کے دل میں غایت درجہ احترام وعقیدت کی دلیل بھی۔

مجھے یاد ہے کہ دو سال قبل رمضان میں جمعہ کے دن مولانا سید عبداللہ حسنی نے خطاب فرمایا تھا، جس میں دائرہ شاہ علم اللہ سے وابستہ کچھ اہم شخصیات کا تذکرہ کیا تھا۔ امام العارفین سید شاہ علم اللہ حسنی، امیر المؤمنین سید احمد شہید، زبدۃ الاولیاء سید شاہ ضیاء النبی حسنی، علامہ حکیم سید عبدالحئی حسنی اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا تذکرہ کرتے ہوئے اور ان بزرگوں کا ایک ایک امتیازی وصف بتاتے ہوئے انھوں نے عہد حاضر میں ملت اسلامیہ ہندیہ کے قائد ورہنما، اپنے چچا، خسر اور مربی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا بھی تذکرہ کیا۔ انھوں نے مولانا کا سب سے امتیازی وصف انکسار وتواضع بتایا۔ دیر تک مولانا کے غایت درجہ تواضع کا تذکرہ کرتے رہے اور ان کے وجود کو غنیمت سمجھ کر، اپنی اپنی استطاعت کے مطابق فائدہ اٹھانے کی تلقین بھی فرمائی۔

جو شخص خود مرجع خلائق بنا ہوا ہو اور سیکڑوں لوگوں کا مرشد ومربی ہو، اس کا اس طرح کے اقدامات کرنا انتہائی عظمت وبلندی کی دلیل ہے۔ عہد حاضر کے علماء میں اور خاص طور پر ان علماء میں جو خود بیعت وارشاد کا وسیع سلسلہ رکھتے ہوں یہ چیز بہت کم نظر آئے گی کہ وہ اپنے عہد کے بزرگوں کے پاس کثرت سے حاضری دیں اور ان سے استفادے کی کوشش کریں۔ مرجعیت حاصل ہوجانے کے بعد بھی کسی کو اپنا بڑا اور مرشد ومربی سمجھتے رہیں۔ اسی کے مشورے سے ہر قدم اٹھائیں اور اگر اس کی مرضی نہ ہو تو اپنی بڑی

سے بڑی خواہش کو پورا کرنے سے رک جائیں۔ کیوں کہ یہ عظیم وصف عنقا ہوتا چلا جارہا ہے، اسی لیے ہر شخص اس مقام تک نہیں پہنچ پاتا جس مقام پر داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی بہت کم وقت میں پہنچ گئے تھے۔

میدان عمل میں

داعی اسلام مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی کا کمال یہ ہے کہ ان کے ہاں ہمیں تربیتِ ذات کی فکر اور دعوتی، اصلاحی و تربیتی خدمات ایک ساتھ چلتی نظر آتی ہیں۔ حالاں کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں عام طور پر دو رویے پائے جاتے ہیں۔ یا تو لوگ صرف حصول علم کو کافی سمجھ لیتے ہیں۔ یا حصول علم کے بعد کسی شیخ و مربی سے وابستہ ہو کر اس کے پاس کچھ وقت گزارتے ہیں اور پھر خود کو "فارغ الاصلاح" سمجھ کر مختلف خدمات کے لیے میدان میں اتر جاتے ہیں۔ اگر کسی کو اس کے شیخ نے کسی وجہ سے مناسب سمجھ کر خلافت سے نواز دیا ہو، تب تو گویا اس شخص کی صالحیت اور تزکیے و طہارت پر مہر ثبت ہوگئی۔ جب کہ اسلامی تعلیمات اور عہد نبوی سے لے کر اکیسویں صدی تک اصلاح و تربیت کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دونوں ہی رویے نہایت مہلک اور خطرناک ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں مولانا عبداللہ حسنی کا کردار انتہائی مثالی اور روشن نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے خاندان کے جن بزرگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا یا اُن کے بارے میں سنا، وہ سب کے سب اخلاص کی دولت سے مالا مال تھے۔ انھوں نے اپنے جد امجد شیخ قطب الدین مدنی سے لے کر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی تک ہر شخص کو سراپا اخلاص اور رضائے الٰہی کے لیے خدمت اسلام میں مشغول پایا۔ نہ مال و زر کی حرص، نہ عہدے اور کرسی کا لالچ اور نہ نام و نمود کی تمنا۔ ان بزرگوں نے جو بھی کیا رضائے الٰہی کے لیے کیا اور جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ بھی صرف خوش نودی رب کے لیے۔ بزرگوں کی اسی روایت پر چلتے ہوئے مولانا نے بھی اپنے ہر عمل کا مقصود پروردگار عالم کی خوشی اور رضامندی کو بنایا۔ پوری زندگی مختلف ناحیوں سے اسلام کی خدمت کرتے رہے، لیکن نہ دنیا سے اس کا بدلہ چاہا، نہ کسی عہدے کے لیے توڑ جوڑ کی

اور نہ اپنی خدمات کا پروپیگنڈہ کیا۔ گویا شمیم جے پوری کے الفاظ میں:

نہ راہ زن کے لیے ہے نہ راہ بر کے لیے
مری متاع محبت ہے اک نظر کے لیے

اگرچہ وہ اس دنیا میں فطری عمر سے بھی کم رہے لیکن کم وقت میں زیادہ کام کر گئے۔ اس طرح انھوں نے امام نووی، امام غزالی، حضرت سید احمد شہید، علامہ عبدالحئ لکھنوی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، اپنے دادا حکیم سید عبدالحئ حسنی اور اپنے والد محترم مولانا سید محمد حسنی کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کی خدمات بہ یک وقت تین میدانوں میں جاری تھیں:

(۱) تدریس
(۲) اصلاح و تربیت
(۳) دعوت

تدریس

۱۹۷۷ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے حدیث کے موضوع پر اختصاص کر لینے کے بعد مولانا جنوری ۱۹۷۸ء میں دارالعلوم میں ادب عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس وقت ان کے والد محترم باحیات تھے اور ''البعث الاسلامی'' کے بانی مدیر کی حیثیت سے عالم اسلام میں ندوے کی آفاقی فکر کی شان دار نمائندگی کر رہے تھے۔ چناں چہ والد محترم کی رہ نمائی اور اپنے دادا (مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی) کی سرپرستی میں انھوں نے ندوے میں تدریس کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ اپنے چچا (مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی) کے شروع کیے ہوئے عربی مجلے ''الرائد'' سے بھی وابستہ ہو گئے۔ الرائد میں مضامین لکھتے اور اپنے بڑوں کی ہدایت کے مطابق اس کے دوسرے کام بھی کرتے رہتے۔ مولانا کی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ انھیں اپنے دادا، والد اور چچا جیسے عظیم عربی داں حضرات کی سرپرستی میں مضمون نگاری کی ابتداء کرنے کا موقع میسر آیا۔ جدید عربی زبان وادب کا ذکر آئے اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ذکر نہ آئے؟ برصغیر میں عربی صحافت کا تذکرہ ہو اور مولانا سید محمد الحسنی کو یاد نہ کیا جائے؟ عربی تاریخ، ادب اور صحافت کے رجال عظیم کی فہرست تیار کی جائے اور اس میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا نام سنہرے حرفوں میں نہ لکھا جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان تینوں افراد کی مسلسل سرپرستی اور رہ نمائی نے مولانا کو عربی مضمون نگاری اور انشاء پردازی کے اعلیٰ مراحل طے کرائے۔ ایک نہ ہو تو دوسرا اور دوسرا نہ ہو تو تیسرا۔ غرض یہ کہ مولانا اگر بچنا

بھی چاہتے تو نہیں بچ سکتے تھے۔ لیکن وہ تو نہایت سعادت منداور محنتی طالب علم تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس نادر موقعے سے فائدہ اٹھایا اور عربی مضمون نگاری و انشاء پردازی میں کمال حاصل کرلیا۔ ہم اس مدت کو مولانا کی عربی دانی کے لیے سب سے اہم اور سنہری دور کہہ سکتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت مولانا ندوے سے تدریس کا معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ آگے چل کران کی خانگی ضروریات کو دیکھتے ہوئے جانشینِ مونگیری مولانا سید منت اللہ رحمانی (ولادت: ۱۹۱۱ء، وفات: ۱۹۹۱ء) نے ایک میٹنگ میں مولانا کو تنخواہ دیے جانے کی بات رکھی تو مولانا نے اپنے خاندان کے بڑوں کے مشورے اور اجازت کے بعد تنخواہ کو قبول فرمالیا۔ البتہ اس فکر میں رہے کہ حسب ضرورت آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نکل آئے تو تنخواہ لینا بند کردیں۔

والد محترم کی وفات

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد بنے ہوئے ایک سال گزر چکا تھا اور دوسرا سال چل رہا تھا۔ ندوے کی تمام تعلیمی، علمی اور فکری سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری تھیں۔ تمام شعبے اور وابستگان ندوہ پوری یک سوئی اور اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی ذمے داریوں میں مصروف تھے کہ اچانک ایک حادثے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ خاص طور پر مولانا عبداللہ حسنی کے لیے یہ حادثہ انتہائی محرومی اور رنج وغم کا باعث ہوا۔ یعنی ۱۳؍جون ۱۹۷۹ء کو مولانا سید محمد حسنی چند گھنٹوں کی علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ گویا برصغیر میں عربی صحافت کا قافلہ سالار زندگی کی روح پھونک کر اچانک خاموش ہوگیا۔ ندوے کی آفاقی فکر کا پرزور ترجمان باطل کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کرتے کرتے اچانک منظر نامے سے غائب ہوگیا۔ کیا ہوا؟ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ہاں کل من علیھا فان کی صدائے غیب سب نے سنی اور سر تسلیم خم کردیے۔ قربان جایئے مخدوم گرامی مرتبت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صاف گوئی اور تواضع وانکسار پر کہ

مولانا محمد الحسنی کے متعلق فرماتے ہیں:

"انھوں نے اپنے چچا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مفکرانہ اور داعیانہ جدوجہد کے طرز کو اختیار کیا تھا اور ان کے صحیح جانشین بننے کے لائق ہوگئے تھے۔"

یہ بات خود وہ شخص کہہ رہا ہے جو خود مولانا سید ابوالحسن ندوی کی جانشینی کی مسند پر جلوہ افروز ہے۔ بہ ہر حال اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا سید محمد حسنی کی اچانک وفات مفکر اسلام، خانوادۂ علم اللہی، ندوی برادری اور پوری ملت اسلامیہ کے لیے نہایت دل دوز تھی۔ وفات کے وقت ان کی عمر صرف ۴۴ سال تھی۔ نہ کوئی بیماری نہ کم زوری۔ یوں سمجھیے کہ چلتے پھرتے "خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا" امت اسلامیہ نے اپنا ایک لائق فرزند اور مستقبل کی بے پناہ امیدوں کا مرکز کھودیا تھا۔ مولانا عبداللہ حسنی کے لیے یہ حادثہ سب سے جاں کاہ اور دردناک تھا۔ کیوں کہ ان کے سر سے شفقت پدری کی چادر چھین لی گئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے مشفق باپ سے محروم ہوگئے تھے بل کہ کم عمری میں ہی ان کے اوپر دو نہایت اہم ذمے داریاں آپڑی تھیں۔ یہ دونوں ذمے داریاں ایسی تھیں جن کو ادا کرتے کرتے جوان کب بوڑھے ہوجاتے ہیں، پتہ بھی نہیں چلتا۔ پہلی ذمے داری اپنے گھر کی مالی کفالت کی تھی اور دوسری اپنے دو کم عمر بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی۔ چوں کہ یہ دونوں معاملات داخلی ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کسی گھر والے سے دریافت کیا جائے کہ مولانا نے اپنی تدریسی و صحافتی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ان دونوں بڑی ذمے داریوں کو کس طرح نبھایا؟ وہ ان ذمے داریوں کو ادا کرنے میں کس حد تک کام یاب ہوئے؟ مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی اور جانشین مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی بیان کرتے ہیں:

"تدریس کو شروع کیے ہوئے ابھی دو ہی سال ہوئے تھے کہ اُن پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اچانک ہمارے والد ماجد مولانا سید محمد الحسنیؒ کی وفات کا سانحہ پیش آیا اور چند گھنٹوں میں سب کچھ ہوگیا۔ حضرت مولاناؒ (علی میاں ندوی) سفر پر

تھے۔ واپس تشریف لائے تو تدفین ہو چکی تھی۔ بھیا سامنے آئے۔ لپٹا لیا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اب بھیا ہی گھر کے بڑے تھے۔ البتہ حضرت مولاناؒ کی سرپرستی سب کے لیے باعث تسکین تھی۔

انھوں نے گھر کو سنبھالا۔ تدریس کا معاوضہ وہ لیتے نہیں تھے۔ الرائد سے کچھ الاؤنس ملتا تھا اور کچھ آمدنی مطلب سے ہوتی تھی، جو ہمارے گھر میں پشتوں سے قائم تھا اور اس وقت اس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب بیٹھا کرتے تھے، جن کا والد صاحب سے بڑا گہرا تعلق تھا۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد کا زمانہ کچھ تنگی ترشی میں بھی گزرا۔ کبھی کبھی والدہ مرحومہ کو بڑی دشواری ہوتی تھی۔ بھیا اس کو محسوس کرتے تھے اور کہیں سے کچھ نہ کچھ انتظام کر لیتے تھے۔ والدہ بڑی غیرت مند خاتون تھیں۔ قرض لینا بھی ان کو گوارا نہیں ہوتا تھا۔ ان کو بھیا کی احتیاط معلوم تھی پھر بھی ہمیشہ تحقیق کرتیں کہ کہاں سے انتظام کر کے لائے ہو؟ اطمینان ہونے پر ہی اس کو استعمال میں لاتیں۔ ان کو یوں بھی دنیا کا کوئی شوق نہیں تھا۔ نہ کھانے کا، نہ پہننے کا۔ اپنے معمولات کی بڑی پابند تھیں۔ فجر بعد کی تلاوت کا ناغہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ جب تک رہیں ہمارے گھر میں کھانے سونے کا نظام درست رہا۔ ان کے بعد بھیا نے یہ ذمے داری سنبھال لی تھی۔ وہ ہمیشہ رات کو جلدی سونے کی تاکید کرتے تا کہ فجر کی نماز میں کوتاہی نہ ہو اور تہجد پڑھنے والوں کو دشواری نہ ہو۔

والد ماجدؒ کے انتقال کے بعد ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم و تربیت کا بھیا نے پورا ذمہ لے لیا۔ والد صاحبؒ کے سامنے بھی وہ ہم لوگوں کی فکر رکھتے تھے۔ عمار بھیا (مولانا سید عمار عبد العلی حسنی ندوی) کا حفظ خود انھوں نے ہی شروع کرا دیا تھا اور اب تو وہی ہمارے ولی تھے۔ ہماری تعلیم انھوں نے انوکھے انداز سے شروع کی۔ بہ جائے مدرسہ میں داخل کرنے کے انھوں نے ندوے کے مختلف اساتذہ سے بات کی اور الگ سے ہمیں تعلیم دینے کا نظام بنایا۔ ہمیں لے جا کر مولانا مرتضی صاحب کی نگرانی میں بٹھایا، جو ایک طرح سے خاندان ہی کے

بزرگ تھے۔ ہمارے پھوپھا مولانا سید محمد ثانی حسنی کے بڑے مخلص اور چاہنے والے دوست تھے۔ حضرت مولاناؒ سے والہانہ تعلق تھا۔ گھر کے بچے بچے سے ان کو پیار تھا۔ ہم دن بھر وہیں رہ کر تعلیم حاصل کرتے۔ خود مولانا مرتضیٰ صاحب نے فارسی پڑھائی۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالغفار صاحب نگرامی نے صرف ونحو اور بعض دوسرے اساتذہ نے اور کتابیں۔ بھیا نے یہ نظام تعلیم قدیم طرز تعلیم سے لیا تھا۔ گرچہ بعض حضرات نے اس کو زیادہ مفید نہیں سمجھا لیکن بھیا اسی کو تربیت وتعلیم کے لحاظ سے مفید سمجھتے تھے اور ان کا یہ تجربہ مفید ہی ثابت ہوا۔ بھیا کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی فکر رہتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے ہم پر بڑی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ دو سال کی تیاری کے بعد انھوں نے ہم کو ہشتم معہد میں داخل کرایا۔ پھر ہشتم عربی تک پوری نگرانی اسی طرح رکھی۔ عالیہ رابعہ (ندوے میں مرحلۂ عالمیت کا آخری سال) تک نہ ہم نے بورڈنگ کی شکل دیکھی تھی نہ کینٹین کی۔ اس کے جو فوائد ہوئے، وہ ہم جانتے ہیں۔ بھیا کے احسانات تو بے شمار ہیں۔ اس احسان کو بھی ہم عمر بھر نہیں بھول سکتے۔"(۱)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے دوران ۱۹۹۷ء میں ندوے کی جانب سے عالمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس تاریخی اجلاس میں عرب وعجم کی عظیم شخصیات جمع ہوئیں۔ کانفرنس کے دفتر انچارج مولانا عبداللہ حسنی تھے۔ انھوں نے اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کردیے اور اپنی اہم ذمے داری بہ خوبی نبھائی۔ ساتھ ہی امام حرم کے خطبے کا اردو ترجمہ کرکے اپنے بڑوں کی دعائیں بھی حاصل کیں۔

طرز تدریس

اصولی طور پر مولانا کے درس کو ان نکات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) تصحیح عبارت

درجے میں پہنچنے کے بعد مولانا کسی طالب علم سے نام لے کر یا عمومی انداز میں

---

(۱) ماہ نامہ پیام عرفات، خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی، ص: ۷۸، ۷۹

عبارت پڑھنے کو کہتے تھے۔ قرآن حدیث کی تدریس کے وقت وہ الفاظ کی صرفی تحلیل یا جملے کی نحوی ترکیب کے قائل نہ تھے۔ البتہ طالب علم ذرا بھی اعرابی غلطی کرتا تو فوراً ٹوک دیتے۔ غلطی زیادہ بھونڈی ہوتی تو بھی طلباء کو نحوی صرفی قواعد و تراکیب میں پھنسا کر رعب گانٹھنے کی کوشش نہ کرتے، بل کہ قدرے ناگواری کے ساتھ تصحیح عبارت کی ترغیب دیتے۔ جو طلبہ اونچی کلاسوں میں عبارت کی فاش غلطیاں کرتے تھے ان کے لیے اکثر یہ بات کہا کرتے تھے کہ "اپنی ابتدائی کمیوں کو جتنی جلدی دور کرلو گے اتنی ہی عافیت میں رہو گے۔ وقت جتنا آگے بڑھتا جائے گا پریشانی بھی بڑھتی جائے گی۔ ان کمیوں کو دور کرنے کے لیے اتنا پڑھو کہ دوسروں کو تمہاری جان کا خطرہ ہونے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر لوگ منع کریں لیکن تم باز نہ آؤ۔ تب جا کر ماضی کی کمیاں دور ہوں گی اور تم اس معیار تک پہنچ جاؤ گے جو اونچے درجات کے طلبہ کا ہونا چاہیے۔ کیوں کہ بہت زیادہ پڑھنے سے ان طلبہ کو روکا جاتا ہے، جو درجے میں صحیح چل رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ماضی کی بنیادی غلطیوں کی تلافی کے لیے تو اتنا ہی پڑھنا پڑے گا۔"

(ب) لغوی تشریح

عبارت خوانی کے بعد مولانا بلا کسی تمہید یا تقریر کے درس شروع کر دیتے تھے۔ الفاظ کی لغوی تشریح اور ان کے ٹیمپریچر (Temperature) کی طرف توجہ دلاتے۔ اہم الفاظ کے مترادف الفاظ بیان کرتے اور ان لفظوں کا فرق بتاتے۔ تاکہ طالب علم کلام الٰہی یا کلام نبوی کے اعجاز سے واقف ہو سکے۔

(ج) تشریح

عبارت کی تشریح کرتے وقت مولانا اہم الفاظ کی لغوی شرح کے ساتھ پوری عبارت کے مقصود و مدعا کو بھی بیان کرتے تھے۔ وہ ان مدرسین میں سے نہیں تھے جو بھاری بھرکم الفاظ کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور درس کو مقفیٰ و مسجع خطاب کی شکل دے دیتے ہیں۔ مولانا نہایت عام فہم انداز میں سادہ سی گفتگو کرتے چلے جاتے تھے۔ نہ تو سخت بیانی

سے کام لیتے تھے اور نہ ہی واضح باتوں کو بار بار دہرا کر طلباء پر بار ہوتے تھے۔ بل کہ جملے کا مفہوم بیان کر کے فوراً مثالوں کے ذریعے یا قرآن و حدیث کے کسی فرمان یا سلف صالحین میں سے کسی کے قول یا واقعے کے ذریعے بات سمجھاتے تھے۔ یہ تشریح اور تشریح کے دوران مولانا کے بیان کردہ اقوال و واقعات اکثر طلبہ کے دوران موضوعِ گفتگو بن جاتے تھے۔ عبارت کی مناسب تشریح کرنے کے بعد وہ فوراً آگے بڑھ جاتے تھے۔

(د) باطل افکار و نظریات کا رد

مولانا عبداللہ حسنی مدارس اسلامیہ کے طلبہ کو قوم کی امانت اور امت مسلمہ کا مستقبل سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ اس بات کا حد درجہ التزام کرتے تھے کہ طلبہ اور علماء موجودہ دور میں پائے جانے والے باطل نظریات اور منحرف افکار سے واقف ہوں اور امت مسلمہ کو خالص قرآن و سنت کی بنیادوں پر عمل پیرا کرنے کی تیاری کریں۔ اس سلسلے میں وہ بغیر کسی رورعایت کے گفتگو کرتے تھے۔ لیکن کبھی کسی تحریک، تنظیم یا جماعت کا نام لے کر اس کی تردید کرنے کے قائل نہ تھے۔ فکر کی سلامتی انہیں اپنے آباء و اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اختلاف کے آداب اور تردید کے اصول بھی سکھائے گئے تھے۔ وہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جیسی جلیل القدر ہستی کے پوتے اور تربیت یافتہ تھے۔ وہ ابوالحسن ندوی، جس نے قادیانیت کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے کتاب لکھی تو جہاں جہاں نبوت کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے انسان مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر آیا، وہاں بھی سطحیت یا مناظرانہ انداز اختیار نہیں کیا، بل کہ ہر جگہ "مرزا صاحب" کے الفاظ استعمال کیے اور دنیا کو اختلاف کا ادب سکھایا۔ اسی راہ پر چلتے ہوئے مولانا عبداللہ حسنی بھی کبھی کسی کی تضحیک یا تذلیل نہیں کرتے تھے۔ ہاں، کوئی غلط سوچ یا نظریہ کسی بھی جماعت یا تنظیم میں نظر آتا تو اس نظریے اور سوچ کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتے۔ طلبہ کو اس غلط نظریے سے واقف کراتے، اس کے مفاسد و مضرات بیان کرتے اور اس سلسلے میں مزید مطالعے کی ترغیب دیتے تھے۔ خاص طور پر قرآن کریم سے ربط و تعلق، حجیت حدیث، عظمت صحابہ،

اکرام اہل بیت، تعظیم سلف صالحین اور مغربیت و مادیت پرستی کے متعلق کھل کر گفتگو کرتے تھے۔ ان تمام چیزوں کے متعلق نہایت معتدل اور مضبوط نظریہ رکھتے بھی تھے اور اس کی تلقین بھی کرتے تھے۔ بسا اوقات بڑے درد و کرب کے ساتھ کہتے تھے کہ "ذرا بھی پھسلے تو کہیں سے کہیں پہنچ جاؤ گے۔ بڑے بڑے مدارس کے فارغین کو ہم جانتے ہیں جو قادیانی ہو گئے یا عیسائی مشنریوں کے ساتھ کام کرنے لگے۔" طلبہ و علماء کو بیسویں صدی کے ہندستانی علماء میں سے علامہ شبلی نعمانی، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ عبدالباری ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور اپنے جد معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتابوں کے بہ کثرت مطالعے کی تلقین کرتے تھے۔ یہ سب ایسے لوگ تھے جن کے ہاں فکری استقامت بھی تھی اور خیال کی وسعت بھی۔ مولانا کی نظر میں علم یا کسی ادارے کی سند عالمیت و فضیلت اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی تھی جب تک کہ وہ فکر کی مضبوطی اور نظریات کی وسعت و آفاقیت کی حامل نہ ہو۔ وہ باطل افکار اور نظریات کا رد کرتے بھی تھے اور طلبہ کو ان سے واقفیت کا حکم بھی دیتے تھے لیکن کبھی مناظرانہ سطحی انداز کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ سنجیدہ مطالعہ کر کے سنجیدگی کے ساتھ مسکت جواب دینے کے قائل تھے۔

(ھ) شفقت و نرمی

ایک کامیاب مدرس کے لیے جتنا ضروری یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقہ موضوع پر عبور رکھتا ہو، اتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ وہ طلباء کا خیر خواہ ہو۔ درجے میں بیٹھ کر ہنگامہ خیزی کے ساتھ درس دینے سے کوئی کامیاب مدرس نہیں ہو جاتا۔ کامیاب مدرس ہونے کے لیے لازمی شرط یہ بھی ہے کہ استاد اپنے طلباء کی بھلائی چاہے۔ ان کے مسائل کو سمجھے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ اس کا تعلق صرف درجے تک محدود نہ ہو بل کہ وہ ان کے تمام مسائل سے دل چسپی رکھتا ہو اور ان کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ اسلامی تاریخ اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ اساتذہ اپنے تلامذہ کو علم سے

سیراب بھی کرتے تھے اوران کے عائلی وخاندانی مسئلے بھی نمٹاتے تھے۔اس شفقت ونرمی اور ہم دردی وخیر خواہی کے نتیجے میں اساتذہ کووہ شاگرد ملتے تھے، جوزندگی بھران کے پیغام کوآگے بڑھاتے اوراپنے اساتذہ کا نام زندہ رکھتے تھے۔پوری اسلامی تاریخ کی بات کی جائے توبات بہت لمبی ہوجائے گی۔صرف ہندستان میں بیسویں صدی کی دوعظیم شخصیات کودیکھیے۔ایک شیخ الہند مولانامحمودحسن دیوبندی اوردوسرے شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی۔ شیخ الہند کوعلامہ انورشاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثانی اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے فدائی تلامذہ ہاتھ آئے تو دوسری طرف شمس العلماء کوعلامہ سید سلیمان ندوی، علامہ عبدالباری ندوی اور مولاناعبدالسلام ندوی جیسے باپ سے زیادہ محبت کرنے والے شاگرد ملے۔غرض یہ کہ استاد،بڑااستادنہ رہے بل کہ باپ کی شکل میں سامنے آئے۔وہ صرف درس وتدریس پراکتفانہ کرے بل کہ شاگردوں کے مسائل سے بھی دل چسپی لے۔اس اصول پردیکھا جائے تو عہد حاضر میں مولانا عبداللہ حسنی ندوی ایک منفرد مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ ہر سال بیسیوں نہیں پچاسوں لڑکے ان سے ربط پیدا کرتے اوراپنے ذہنی،فکری، تعلیمی، خاندانی اور مالی مسائل ذکر کرتے رہتے۔مولاناان تمام مسائل کوسنتے اوران کوحل کرنے کی پوری کوشش کرتے۔یہ سلسلہ صرف زمانۂ طالب علمی تک محدودنہیں رہتا تھابل کہ فراغت کے بعدبھی بے شمارطلباء مولاناسے مشورہ کرتے اوراپنی آگے کی زندگی کالائحہ عمل طے کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مولاناکوتنہاشاذونادرہی دیکھاجاتا۔وہ مرجعیت جوبڑے بڑے شیوخ حدیث اورطویل العمراساتذہ کوحاصل ہوتی ہے،وہ مولاناکوصرف چالیس پینتالیس سال کی عمرمیں حاصل ہوگئی تھی۔نہ جانے کتنے طلباء ندوے آکرمولاناسے جڑے اورندوے سے فارغ ہوکرمولاناہی کی سرپرستی میں اپنی زندگی کے سفرکوآگے بڑھایا۔

آج مولاناکے اچانک اٹھ جانے کے بعدملک وبیرون میں پھیلے ہوئے مولانا کے سیکڑوں تلامذہ ایسے ہیں جومسلسل خون کے آنسورورہے ہیں اورایسامحسوس کررہے ہیں کہ وہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔انھوں نے مولاناکے حادثۂ وفات پربے تحاشاآنسو

بہائے، ایصال ثواب کا اہتمام کیا اور آج بھی انہیں لگ رہا ہے کہ ان کے سر سے کوئی سایہ دار درخت ہٹ گیا ہے، جس کے بعد وہ زندگی کے وسیع و عریض صحراء میں بے سہارا اور بے سایہ ہو گئے ہیں۔ یہ کشش اور محبت صرف درس و تدریس کا نتیجہ نہیں ہے بل کہ اس میں مولانا کی اس شفقت اور محبت کا بہت بڑا دخل ہے، جو مولانا اپنے سے وابستہ ہر طالب علم کے ساتھ رکھتے تھے اور حتی الامکان یہ کوشش کرتے تھے کہ اس کے مسائل حل ہوں اور وہ دین کے حصول اور دین کی خدمت کے لیے تیار ہو سکے۔

درس حدیث

دار العلوم ندوۃ العلماء میں مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا تقرر عربی زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے ہوا تھا۔ آگے چل کر وہ عربی ادب کے علاوہ فقہ، اصول فقہ، قواعد و انشاء اور تفسیر قرآن کی تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ لیکن وہ تمام دینی حلقوں میں ندوۃ العلماء کے سنیئر استاد حدیث کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ کیوں کہ ادھر کافی عرصے سے احادیث مطہرہ کے مستند ترین مجموعوں کی تدریس ان سے متعلق تھی۔ ندوے میں ان کی تدریسی خدمات کا دائرہ ۴۵ سال پر مشتمل ہے۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے زیادہ تر علوم حدیث کی خدمت انجام دی۔ امیر المؤمنین فی الحدیث امام محمد ابن اسمٰعیل بخاری (ولادت: ۱۹۴ھ، وفات: ۲۵۶ھ) کی صحیح بخاری اور امام ابوعیسیٰ محمد ابن عیسیٰ ترمذی (ولادت: ۲۰۹ھ وفات: ۲۷۹ھ) کی جامع ترمذی کی تدریس خصوصیت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ علامہ خطیب تبریزی (وفات: ۷۴۱ھ) کی مشکوٰۃ المصابیح کا درس بھی طویل عرصے تک دیا۔

احادیث نبویہ مولانا کا اختصاصی موضوع بھی تھیں اور ان کو فطری طور پر ان سے انتہائی درجہ شغف بھی تھا۔ بہت سے لوگ احادیث کی بڑی کتابوں کا درس دینے کے بعد حدیث کے کسی چھوٹے مجموعے کا درس دینے میں جھجک اور تکلف محسوس کرتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ حدیث ان کا اختصاصی موضوع یا اشتغال و مصروفیت کا مرکز تو بن جاتی ہے لیکن ان کے دل و دماغ اور رگ و ریشے میں سرایت نہیں کرتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ

حدیث کو بڑی اور چھوٹی کتابوں کے خانے میں بانٹ دیتے ہیں۔ حدیث ایک مجموعی موضوع یا ایک جامع ترین ہدایت نامے کی حیثیت سے ان کے ذوق و وجدان پر طاری، نہیں ہوتی۔ مولانا عبداللہ حسنی ان خوش نصیب محدثین میں سے تھے، جنھوں نے حدیث کو اپنا اختصاصی موضوع بھی بنایا تھا، اپنی مصروفیتوں کا مرکز بھی قرار دیا تھا اور ان سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کے ایک ایک عمل کے لیے اسے ہادی و رہ نما کے طور پر برتا بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء جیسی عالمی دانش گاہ میں بخاری و ترمذی کے علوم سے طلباء کو سیراب کرنے والا یہ محدث تکیہ کلاں، رائے بریلی کی چھوٹی سی مسجد میں، علماء و عوام اور شہریوں و دیہاتیوں کے ملے جلے مجمع کے درمیان گھرا ہوا، چٹائی پر بیٹھ کر، حدیث نبوی کے چھوٹے سے مجموعے ''تہذیب الاخلاق'' کا درس بھی اسی لطف و چاشنی اور دل چسپی و کیفیت کے ساتھ دیتا تھا، جس طرح وہ ندوے میں حدیث کے جلیل القدر مجموعوں کا درس دیتا تھا۔ تہذیب الاخلاق کے دروس میں شریک ہونے والے سیکڑوں طلبائے ندوہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انھیں مولانا کے انداز بیان اور جوش و ولولے میں قطعاً کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مولانا حدیث کو حدیث سمجھتے تھے۔ نہ صرف سمجھتے تھے، بل کہ اسے حدیث سمجھ کر برتتے بھی تھے اور دوسروں کو بھی ہمہ وقت اس کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ حدیث نبوی سے ان کی غایت درجہ دل چسپی کا نتیجہ تھا کہ وہ ندوے میں حدیث کے ایک کام یاب استاد سمجھے جاتے تھے۔

مولانا کے درس حدیث کے کئی گوشے تھے۔ وہ عربی زبان کے ایک ماہر کی حیثیت سے الفاظ پر بھی گفتگو کرتے تھے اور حدیث کے بحر ناپید کنار کے غواص کی حیثیت سے حدیث کی مراد و مقصود بھی بیان کرتے تھے۔ سلف صالحین کی عظمتوں کے علم بردار کی حیثیت سے حدیث کے متعلق اٹھنے والے فتنوں کا علمی و عقلی رد بھی کرتے تھے اور حدیث کے احترام و تعظیم کے متعلق اسلاف کے واقعات بھی سناتے تھے۔ حدیث نبوی کے پیغام کو لے کر اٹھنے والے عالم اسلام کے جیالوں کی تاریخ بھی بیان کرتے تھے اور تحریک ندوہ کے

ایک خادم کی حیثیت سے عالمی پیمانے پر جدید ترین وسائل کو استعمال کرتے ہوئے حدیث کے پیغام کو عام کرنے کی ترغیب بھی دلاتے تھے۔ یہ بات مولانا کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے والے متعدد طلباء نے بیان کی ہے کہ مولانا سے کتنے ہی سوالات کیے جائیں، ناگواری اور ناپسندیدگی کی ادنیٰ سی جھلک بھی ان کے چہرے یا باتوں میں نمایاں نہیں ہوتی تھی۔ یک سوئی اور توجہ کے ساتھ طلبہ کے اعتراضات سنتے اور ان کا شافی جواب دیتے تھے۔ جواب دینے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں پوچھ بھی لیا کرتے تھے کہ "مولوی صاحب! جواب مل گیا؟" کبھی کبھی طالب علم یا سوال کرنے والے کے جواب میں صرف ایک جملہ ارشاد فرماتے اور پوچھنے والے کو اطمینان ہو جاتا۔

درسِ حجۃ اللہ

علوم ولی اللّٰہی ابتداء ہی سے ابناء ندوہ کی تحقیق ومطالعے کا موضوع رہے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغۃ کو امام ولی اللہ دہلوی کے علوم وافکار کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے ابناء ندوہ نے اسے بھی اپنی بحث وتحقیق کا موضوع بنایا۔ علامہ عبدالباری ندوی کا پورا سلسلۂ تجدید بالخصوص معاشیات، معاشرت اور تصوف وسلوک اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ارکان اربعہ بلاشبہ اسرارِ شریعت کے موضوع پر بے مثال چیزیں ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر حجۃ اللہ کا اردو عکس ہیں۔ اسی طرح مولانا سید وصی مظہر ندوی (ولادت: ۱۹۲۴ء، وفات: ۲۰۰۶ء) علوم ولی اللّٰہی سے انتہائی دل چسپی بھی رکھتے تھے اور حجۃ اللہ پر خصوصی نظر بھی۔ ان کی نظر ثانی کے بعد ہی مولانا مفتی محمد سعید پالن پوری (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) کی شرح "رحمۃ اللہ الواسعۃ" منظر عام پر آئی۔ وہ حیدرآباد، سندھ (پاکستان) میں کارپوریشن کے میئر بھی رہے، رکن پارلیمنٹ بھی رہے اور وہاں کی مرکزی حکومت میں وزیر برائے امور مذہب واقلیات بھی۔ چناں چہ ایک طرف انھوں نے "شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج" قائم کیا تو دوسری طرف حجۃ اللہ کے متعلق "افادات شاہ ولی اللہ" جیسی اہم کتاب تصنیف کی۔ اسی طرح مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (ولادت: ۱۹۲۵ء، وفات: ۲۰۰۶ء)

بھی حجۃ اللہ پر تفصیلی کام کر رہے تھے۔افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔البتہ "مقامات حجت" کے نام سے ان کی ایک مفید تصنیف اشاعت کے لیے تیار ہے۔موجودہ لوگوں میں مولانا ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی ندوی (ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) ہندو پاک میں علوم ولی اللّٰہی کے چند اہم ماہرین میں ایک ہیں۔امام دہلوی کے متعلق ان کی نصف درجن اور نہایت وقیع و منفرد تصنیفات سامنے آچکی ہیں۔

اِدھر کچھ عرصے سے ندوے میں حجة الله البالغة کی تدریس بھی مولانا عبداللہ حسنی ندوی کے ذمے ہوگئی تھی۔ برصغیر ہندو پاک میں نبیرۂ نانوتوی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی (ولادت:۱۸۹۷ء، وفات:۱۹۸۳ء) حجۃ اللہ کے ماہر اور متخصص (Specialist) کی حیثیت سے معروف تھے۔اُن کے بعد جہاں جہاں ان کے تلامذہ رہے، اس کتاب کی تدریس میں ممتاز رہے۔ندوۃ العلماء میں طویل عرصے تک استاد عالی مقام مولانا برہان الدین سنبھلی اس کتاب کے علوم سے طلبہ کو سیراب کرتے رہے۔وہ بھی حکیم الاسلام کے خصوصی فیض یافتہ ہیں۔اُن کی سخت علالت کے بعد ہی یہ کتاب مولانا عبداللہ صاحب کو ملی تھی۔ معلوم نہیں کہ کسی طالب علم نے ان دروس کو یک جا کیا یا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ مولانا کو اس کتاب سے مزاجی طور پر مناسبت تھی۔ حکماء اسلام اور صوفیاء کرام کی کتابوں اور ملفوظات کے مطالعے نے مولانا کے مزاج میں عجیب نکتہ آفرینی پیدا کردی تھی۔ وہ عام گفتگو، دروس اور تقاریر میں بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کوئی ایسا نکتہ بیان کردیتے تھے کہ سننے والے تڑپ اٹھتے اور بے حد متاثر ہوتے۔یہ کوئی مبالغہ نہیں بل کہ انٹرنیٹ، کیسٹس اور تحریری شکل میں موجود مولانا کے دروس و تقاریر کے ذریعے بہ آسانی اِن پُرحکمت اقوال اور نکات تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔اس نکتہ آفرینی کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب سے گہری واقفیت بھی حجۃ اللہ کے متن کی تفہیم میں مولانا کی معاون ہوتی تھی۔جس سال یہ کتاب مولانا کو ملی، اُس سال رمضان میں تکیہ کلاں میں دوران اعتکاف مولانا ظہر کے بعد اپنے حجرے میں حجۃ اللہ پڑھاتے تھے۔ مجھے بھی ان دروس میں شرکت کا

موقع ملا۔ اگر چہ کتاب کی ضخامت کے لحاظ سے یہ تدریس نا کے برابر رہی اور چند روز ہی جاری رہ سکی البتہ نسبت کے لیے تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہم نے حجۃ اللہ کے چند مقامات کو مولانا سے سمجھا ہے۔

اگر مولانا کو پوری صحت مندی کے دور میں حجۃ اللہ پڑھانے کا موقع ملتا اور وہ دروس جمع کیے جاتے تو ایک اہم علمی کام سامنے آسکتا تھا۔ اس بات کا اندازہ دوران درس ان چند تشریحات سے ہوسکتا ہے:

(الف) حیاء کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ "حیاء نام ہے امتناع من القبیح (برائی سے رکنے) کا۔ قبیح کی تین قسمیں ہیں: شرعی، عقلی اور عرفی۔ قبیح شرعی سے نہ بچنے والا فاسق ہوگا۔ قبیح عقلی سے باز نہ رہنے والا پاگل کہلائے گا۔ جب کہ قبیح عرفی سے احتراز نہ کرنے والا سنکی اور کھسکا ہوا سمجھا جائے گا۔ قبیح عرفی کی مثال یہ ہے کہ کوئی شریف آدمی سرِ راہ کھانا کھانے لگے یا دینی ادارے کا فارغ یا طالب علم مغربی لباس پہنے یا بغیر ٹوپی نماز پڑھنے لگے۔"

(ب) عشق پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "عشق مجازی عشق نہیں فسق ہے۔ اسے عشق کہا ہی نہیں جاسکتا۔ عشق کبھی فنا نہیں ہوتا اور لافانی ذات صرف اللہ کی ہے۔ عشق مجازی میں کبھی کبھی مبتلا ہونا شباب کی بات ہے اور اس میں پھنس کر رہ جانا نامردی ہے۔"

(ج) سماحت کی تشریح اس دل نشین انداز میں کی: "سماحت جس صفت سے جڑ جاتی ہے، وہ صفت نکھر جاتی ہے۔ اس کا تعلق ہر صفت سے ہوسکتا ہے۔ یہ سخاوت سے جڑ جائے تو اسے کمال درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ عقل و دماغ سے وابستہ ہوجائے تو وہ روحانی لذت سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ شرم گاہ سے وابستہ ہوجائے تو اس کو عفت و پاک دامنی کی انتہاء تک پہنچا دے۔"

اسی کی تشریح کرتے ہوئے حضرت ذوالنفس زکیہ اور خلیفہ منصور عباسی

کا واقعہ بھی سنایا کہ دونوں کے درمیان لشکر کشی ہوئی۔ کئی مرتبہ حملہ کرنے کے باوجود منصور کو حضرت ذوالنفس پر غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ عاجز آ کر اس نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا کہ خود اُن ہی سے معلوم کیا جائے کہ اُن کو شکست کس طرح دی جاسکتی ہے؟ چناں چہ حضرت ذوالنفس سے پوچھا گیا۔ انھوں نے بتادیا۔ اب جو معرکہ آرائی ہوئی تو خلیفہ نے ان ہی کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کیا اور ان کے لشکر کو شکست دے دی۔ اس عجیب واقعے میں حضرت ذوالنفس کا عمل سماحت کی ایک مثال ہے۔ (۱)

(۱) درس حجۃ اللہ کی یہ تینوں مثالیں مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کی سوانح مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کے مسودے سے (الفاظ کے کچھ حذف واضافے کے ساتھ) لی گئی ہیں۔ اجمل

اصلاح وتربیت

داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی زندگی کا دوسرا اہم گوشہ اصلاح و تربیت کا ہے۔اس گوشے کو ہم دوسرا گوشہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ زمانی لحاظ سے مولانا نے پہلے تدریس کے میدان میں قدم رکھا اور اس کے بعد اصلاح وتربیت کے میدان میں۔

ندوۃ العلماء میں تدریس کے آغاز کے وقت اگرچہ وہ کسی مرشد کے خلیفہ یا جانشین نہیں تھے، لیکن اپنی کم عمری کے باوجود ایک مدرس پر عائد ہونے والی غیر درسی ذمے داریوں کو بہ خوبی سمجھتے تھے۔انھیں خوب معلوم تھا کہ ایک مدرس کو نرا مدرس نہیں، مربی اور مزکی بھی ہونا چاہیے۔اس کی ذمے داری کلاس کی چہار دیواری پر ہی ختم نہیں ہوتی بل کہ طلبہ کی پوری زندگی پر پھیلی ہوتی ہے۔اس کا کام ہوتا ہے کہ وہ تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت کرے اور ان کو پوری زندگی صالح فکر اور صالح تربیت میں گزارنے کے لیے تیار کردے۔چناں چہ اپنی ذمے داری کو سمجھتے ہوئے مولانا نے ابتدا ہی سے طلبہ کی ذہن سازی اور ذہنی وفکری تربیت کا کام شروع کردیا۔شروع ہی سے طلبہ ان سے قریب رہنے اور اپنے مسائل بیان کرنے لگے تھے۔مولانا کبھی کھانے کی دعوت، کبھی چائے اور ناشتے کی دعوت اور کبھی کسی دینی اجتماع یا دینی شخصیت سے ملاقات کی دعوت کے ذریعے طلبہ کی تربیت کی راہ ہم وار کرتے تھے۔یہ سلسلہ روز بہ روز بڑھتا ہی چلا گیا۔آخری وقت میں نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ مولانا فجر کی نماز سے لے کر آرام گاہ میں تشریف لے

جانے تک طلبہ سے ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔ مولانا ندوے کے تعلیمی اوقات میں ایک درجے سے دوسرے درجے تک جا رہے ہوں، الرائد کے دفتر میں بیٹھے ہوں، لکھنؤ میں اپنی رہائش گاہ ''خاتون منزل'' میں ہوں یا تکیہ کلاں، رائے بریلی میں ہوں، وہ جہاں بھی ہوتے طلبۂ مدارس یا اپنے ان تلامذہ سے گھرے رہتے، جو ملک بھر میں مختلف ذمے داریاں ادا کر رہے ہیں۔ ہر شخص ان سے اپنے مسائل کہتا اور ان مسائل کا مناسب حل لے کر خوش و خرم لوٹتا۔ ندوے میں پڑھنے والے مجھ جیسے ہزاروں طلبہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ کسی طالب علم کو کسی طرح کا کوئی تعلیمی، روحانی، مالی یا خانگی مسئلہ درپیش ہوتا تو اس کے ساتھی اسے مولانا کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے۔ کسی کے گھر سے کوئی آتا اور ندوے کے کسی بزرگ سے ملنا چاہتا تو طلبہ بے جھجک مولانا کے پاس لے جاتے۔ کسی کے علاقے سے کوئی بدعقیدہ شخص ملاقات کے لیے آجاتا تو بھی طلبہ اسے مولانا سے ملوانا ضروری سمجھتے۔ کسی طالب علم کو اصلاح نفس کا خیال ہوتا تو وہ مولانا ہی کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ کسی کے علاقے میں کوئی دینی جلسہ منعقد ہوتا اور اہل علاقہ اسے کسی ندوی عالم کو لانے کی فرمائش کرتے تو سب سے پہلے وہ مولانا ہی سے وقت لینے کی کوشش کرتا۔ غرض یہ کہ طلبہ کے اکثر مسائل کا حل مولانا کی ذات گرامی تھی۔ طلبہ کا یہ رجوع خود بہ خود نہیں تھا، بل کہ اس میں مولانا کے رویے کا بہت بڑا دخل تھا۔ ان کے ہاں نہ بے جا بندشیں تھیں اور نہ بلاوجہ کی پابندیاں۔ وہ اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے نہ تو طلبہ سے کم آمیزی کو ضروری سمجھتے تھے اور نہ ہی ان کے مسائل سننے میں کسر شان محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے طلبہ کے اس رجوع کو اصلاح و تربیت کا ایک اہم ذریعہ بنا لیا تھا۔ وہ ہر حال میں طلبہ کی تربیت کرنا چاہتے تھے اور کرتے بھی تھے۔ وہ اس کو قانونی ذمے داری نہیں، دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ طلبہ کی ضرورتیں اور مسائل سننے کے ساتھ ساتھ وہ ان کی تربیت بھی کرتے تھے اور کچھ اس طرح کا رویہ اختیار کرتے تھے کہ طالب علم اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان سے جڑ جاتا اور مولانا اسے اپنے دامن فیض سے وابستہ کر کے آہستہ آہستہ اس کی تربیت

کرتے چلے جاتے۔ نہ جانے کتنے طلبہ کی زندگیاں بدلیں، کتنوں کے مسائل حل ہوئے اور کتنے مولانا کی تربیت کے نتیجے میں خود بھی اپنے اپنے علاقوں میں اصلاح وتربیت کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے۔ مولانا نے اصلاح وتربیت کے لیے چار طریقے اختیار کر رکھے تھے:

(۱) بیعت وارشاد
(۲) خطابت
(۳) تحریر
(۴) انفرادی ملاقاتیں

(۱) بیعت وارشاد

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو اللہ تعالیٰ نے بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں دعوت واصلاح، اعتدال وتوازن اور صحیح اسلامی فکر کی ترویج واشاعت کے لیے پیدا فرمایا تھا۔ مولانا کے لیے ہندستان کے تقریباً تمام مصلحین وعلماء کے دلوں میں جو محبت وعظمت تھی وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ انھیں اکثر مشائخ کا مکمل اعتماد حاصل رہا اور شیخ المشائخ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری نے انھیں چاروں سلسلوں میں خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ایک مؤرخ، مصنف، مصلح، مفکر اور داعی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مرشد روحانی کی حیثیت سے بھی معروف ہوئے۔ ہزاروں علماء، قائدین، دانش وران اور عوام الناس نے ان کے دست حق پر بیعت کی اور انھیں اپنا مرشد تسلیم کیا۔ مفکر اسلام نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں حقیقی تصوف کا تعارف کرایا اور دنیا کو دین کے اس اہم گوشے کی طرف متوجہ کیا۔ جب تزکیہ وتصوف کا یہ آفتاب اپنے عروج کو پہنچا تو اس نے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے موقعے اور محل کے اعتبار سے کچھ لوگوں کو مختلف علاقوں میں اپنا خلیفہ بھی نام زد کیا۔ اپنے بعد اپنے تمام کاموں کی جانشینی کے لیے اپنے عزیز از جان اور معتمد علیہ بھانجے مرشد الامۃ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو مقرر کیا۔ ساتھ ہی اپنی مردم شناسی اور حکمت بالغہ کا ثبوت دیتے ہوئے

داعی اسلام مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی کو بھی وفات سے تقریباً دو ہفتے قبل خلیفۂ مجاز قرار دیا۔حالاں کہ اس وقت مولانا کی عمر چالیس سے کچھ ہی متجاوز تھی۔نہ انھیں خلافت کی تڑپ تھی اور نہ کوئی دنیاوی تقاضہ یا دباؤ تھا۔یہ صرف اور صرف ایک اشارۂ غیبی اور مرضی الٰہی تھی کہ مفکر اسلام نے اچانک مولانا کو خلافت سے سرفراز فرمادیا اور اس کے بعد اپنے اس اقدام پر پورے شرح صدر کا بھی اظہار فرمایا۔(۱) گویا خالق کائنات نے مولانا عبداللہ حسنی کی قلت عمر کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے یہ انتظام فرمایا تھا، تاکہ وہ مفکر اسلام کے بعد پوری یک سوئی کے ساتھ اصلاح وارشاد کے کام میں لگ جائیں اور اس راستے سے دین کی اہم خدمات انجام دیں۔

اظہار مشیخت سے دوری

مولانا سید ابوالحسن ندوی کی وفات کے بعد مولانا عبداللہ حسنی پوری یک سوئی اور تن دہی کے ساتھ امت کی روحانی تربیت میں لگ گئے۔لیکن کبھی مشیخت کے معروف اور غیر مسنون انداز کے قریب بھی نہ پھٹکے۔نہ تو اپنا حلقۂ ارادت بڑھانے کی فکر کی اور نہ دوسرے مشائخ ومرشدین پر خود کو فوقیت دی۔نہ تو مفکر اسلام کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنا تعارف کراکر اپنی مسند ارشاد کی عظمت بڑھانے کی کوشش کی اور نہ خود کو اصلاح وتزکیے میں تام اور مکمل سمجھا۔آخر وقت تک اپنے بڑوں کے سامنے سر نیاز خم رکھا اور معاصر مشائخ کا کھلے دل سے اعتراف کرتے رہے۔کیا یہ بات انتہائی تواضع اور عظمت و رفعت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ جو شخص خود سیکڑوں ہزاروں کا مرجع ہو وہ وقتاً فوقتاً اپنی اصلاح کی فکر میں دوسرے علماء ومشائخ کے پاس مسلسل حاضری دیتا رہے؟اس کے پاس کوئی دوسرا عالم دین یا مرشد آئے تو اسے اپنی مسند پر بٹھا کر خود دوزانو بیٹھ جائے؟اپنی مجلسوں اور تقریروں میں اپنے معاصرین کی کتابوں کی تعریف اور ان کے مطالعے کی ترغیب دینے

(۱) شرح صدر کی بات مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نے اپنے مضمون اور کتاب میں بیان کی ہے۔دیکھیے ماہ نامہ پیام عرفات کی خصوصی اشاعت یا مولانا کی (زیر طبع) سوانح عبداللہ۔اجمل

میں ذرا جھجک محسوس نہ کرے؟ مسند ارشاد و تزکیہ پر جلوہ افروز ہونے کے بعد دوسروں کا اعتراف کرنا اور قول و فعل سے ان کی عظمت کا اقرار کرنا زمانے کے عام چلن کے خلاف تو ہوسکتا ہے، لیکن مزاج نبوت اور معمولِ سلف کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔ مولانا نے اس طریقے کو اختیار کر کے مفکر اسلام کی خلافت کا بھی حق ادا کیا اور ایک حقیقی مرشد و مربی کا فرض بھی نبھایا۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی سے انھوں نے جو ظاہری و باطنی فیض اٹھایا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی راہ کو اختیار کریں۔ حد تو یہ تھی کہ مولانا نہ تو کبھی اپنے خلیفۂ ابوالحسن ہونے کا تذکرہ کرتے تھے اور نہ مفکر اسلام کے لیے ''ہمارے مرشد''، ''ہمارے شیخ'' یا ''سیدی و مرشدی'' جیسے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ کیوں کہ اس طرح کے الفاظ سے سننے والوں کو اس بات کا اشارہ مل جاتا ہے کہ فلاں بزرگ سے ہمارے گہرے روابط تھے یا وہ ہمارے شیخ تھے اور ہم ان کے خلیفہ ہیں۔ اس لیے یہ احتیاط کے خلاف ہے۔ یہی رویہ ہمیشہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا بھی تھا اور ہے۔

دوسروں کی طرف رجوع کا مشورہ

مولانا کا معمول تھا کہ کوئی بیعت ہونے کی گزارش کرتا تو اسے اپنے علاقے کے کسی معتبر بزرگ سے رجوع کرنے کو کہتے اور بیعت کے حقیقی تقاضوں اور شرائط سے آگاہ کرتے تھے۔ تاکہ اس پر یہ بات واضح ہوجائے کہ یہ کوئی بے روح رسم نہیں ہے بل کہ ایک بڑی ذمے داری ہے، جو اپنے شیخ سے مسلسل ربط کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔ کبھی کوئی بڑا یا صاحب حیثیت اور صاحب علم شخص بیعت کی درخواست کرتا تو اسے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے بیعت ہونے کا مشورہ دیتے۔ ساتھ ہی اس کی دل جوئی کے لیے یہ بھی فرمادیتے کہ ضرورت پڑنے پر آپ ہم سے رجوع کرسکتے ہیں۔ مولانا کے اس متواضع رویے کا نتیجہ تھا کہ وقت کے تمام بڑے مشائخ اور علماء بھی ان پر مکمل اعتماد کرنے لگے تھے۔ محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق حقی اور مرشد الامۃ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جیسے علماء و مشائخ لوگوں کے استفسار پر اور بیعت کی درخواست کرنے والوں کو مولانا سے رجوع کرنے کو کہتے تھے۔

سب کی نظر میں مولانا کی متحرک شخصیت اور تعلیمی و دعوتی سرگرمیاں تھیں، اسی لیے سب لوگ مولانا پر مکمل اعتبار کرتے تھے اور نئے بیعت ہونے والوں یا اپنے مریدین کو مولانا سے استفادہ کرنے اور احوال بیان کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ وقت کے معتبر ترین علماء اور مستند ترین مشائخ و مرشدین کا ایک کم عمر مرشد پر اتنا بھروسا اور اعتماد کرنا مولانا کے مقام بلند کی واضح دلیل ہے۔

حلقۂ ارادت

جاننے والے جانتے ہیں کہ آخری چند برسوں میں مولانا کا حلقۂ ارادت کافی وسعت اختیار کر گیا تھا۔ ملک بھر میں نہ جانے کتنے لوگ مولانا سے اصلاحی تعلق قائم کیے ہوئے تھے اور ان کی رہ نمائی میں راہ سلوک طے کر رہے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے والے علماء کی تعداد عوام کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ عوام کا کیا ہے؟ وہ تو بشارت آمیز خوابوں اور کشف و کرامات کے اشتہار سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ گورکھ دھندا دکھانے والوں اور جادو ٹونا کرنے والوں کو بھی اپنی عقیدتوں کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ سربراہان مملکت کی چوکھٹوں پر دن رات سجدہ ریزی کرنے والوں اور حکومت کے تعاون سے اپنا کاروبار چمکانے والوں کے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر ان کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن علماء اور فارغین مدارس کا کسی سے قلبی طور پر متاثر ہونا اور اس کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اقرار کر کے خود کو اصلاح کے لیے اس کے سپرد کر دینا، انتہائی درجہ ثقاہت و اعتماد کے بغیر ممکن نہیں۔ جس کے حلقۂ ارادت میں اکثر علماء اور ذمے داران مدارس شامل ہوں، اس کے تقویٰ اور للّٰہیت میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے مولانا عبداللہ حسنی کو بہت کم عمر میں اس مقام پر فائز کر دیا تھا۔ چناں چہ مولانا کے اردگرد ہمیشہ ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے علماء، اساتذۂ مدارس اور دینی اداروں و تنظیموں کے ذمے داران نظر آتے تھے۔ ان علماء میں ندوۃ العلماء اور اس کے فکر و منہج سے وابستہ علماء کے علاوہ دوسرے اداروں و تنظیموں کے علماء بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے۔ علماء کا مطلب

صرف سند یافتہ عالم نہیں بل کہ ایسے علماء، جو خود بھی اپنے اپنے علاقوں میں سند اور مرجع سمجھے جاتے ہیں۔ سب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اپنے ذاتی اور گھریلو مسائل بھی پیش کرتے تھے۔ دینی اداروں اور مدارس وجامعات کے سلسلے میں مشورے بھی کرتے تھے اور اپنے روحانی امراض بھی بیان کرتے تھے۔ مولانا سب کے مقام ومرتبے اور مزاج وذہن کا خیال رکھتے ہوئے مناسب رائے اور مشوروں سے نوازتے تھے۔ ہر شخص ان کے پاس سے اٹھ کر خوش وخرم لوٹتا تھا اور ان کی ہدایات کی روشنی میں اپنا سفر آگے بڑھاتا تھا۔

حقیقی تصوف کے علم بردار

تصوف کو جن وجوہ سے اختلافات کا سامنا کرنا پڑا ان میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ کشف وکرامات اور رؤیا ومنامات کو اصل حیثیت دے دی گئی تھی۔ سیرت رسول اکرم ﷺ، صحابۂ کرام اور سلف صالحین کے معتبر تذکروں کے بہ جائے اپنے سلسلے کے مشائخ اور دوسرے بزرگوں کے غیر معتبر واقعات اور تذکرے سنے سنائے جانے لگے تھے۔ قرآنی تعلیمات، سنت مطہرہ اور آثار صحابہ کے بہ جائے بزرگوں کے معمولات حتیٰ کہ جذب وحال میں ان پر طاری ہونے والی کیفیات کو پڑھ پڑھا کر معرفت الٰہی کے حصول کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ مریدین کو صالح تعلیمات دینے کے بہ جائے ان سے نذر ونیاز لینے پر ساری توجہ مرکوز کردی گئی تھی۔ ان تمام انحرافات کے نتیجے میں وہ طبقہ وجود میں آیا، جس نے تصوف کا سرے سے انکار کیا اور اسے ایک بدترین بدعت سمجھنے لگا۔ داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی ان صوفیاء میں سے تھے، جنھوں نے ہر دور میں ان الزامات کی تلافی کی کوشش کی اور خالص قرآن وسنت کی روشنی میں اصلاح وتربیت کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا کو یہ راستہ ان کے مرشد ومربی مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے دکھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ''کامل اتباع سنت'' کو تصوف کا لب لباب قرار دیتے تھے۔ قرآن وحدیث کو تصوف کی بنیاد سمجھتے تھے اور صحابۂ کرام کے واقعات کو اپنے مریدین کے لیے اصل نمونہ قرار دیتے تھے۔ وہ صاف فرماتے تھے:

"لوگ بزرگ اس کو مانتے ہیں جس سے خارق عادت کرامات کا ظہور ہو۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ وہ فرائض وواجبات، حقوق اللہ وحقوق العباد کا اہتمام کرتا ہو۔ معاملات صحیح ہوں۔ اگر یہ چیزیں نہیں ہیں تو کیسی ہی کرامات صادر ہو جائیں، بزرگ نہیں ہوسکتا۔"

تعلق بالقرآن پر زور

مولانا پوری امت کے لیے اور خاص طور پر راہ سلوک وتصوف پر چلنے والوں کے لیے قرآن کریم سے ربط کو سب سے اہم چیز مانتے تھے۔ وہ اپنے مریدین کو پابندی سے تلاوت قرآن کا حکم دیتے تھے اور اس کے مطالب ومعانی سمجھ کر مضبوطی سے عمل کرنے کو تصوف کا مقصد ومدعا سمجھتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے:

"قرآن سے جڑنے اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے بعد ان پر عمل کر کے ہم کبھی پستی کا شکار نہیں ہوسکتے۔ یہ تو خدا کی رسی ہے۔ اسے پکڑنے والا کس طرح کم زور ہوسکتا ہے؟ شرط یہ ہے کہ جس طرح پکڑنے کا حق ہے اس طرح پکڑا جائے۔ کثرت تلاوت سے دل ودماغ اور چہرے وماحول کو منور کیا جائے اور اس کی ایک ایک ہدایت پر عمل کر کے اپنے کردار کو مثالی بنایا جائے۔ پھر دیکھیے دنیا آپ کا لوہا کیسے نہیں مانتی۔"

کبھی فرماتے تھے:

"جو منصف ہیں وہ قرآن پر رشک کرتے ہیں اور جو غیر منصف ہیں وہ حسد کرتے ہیں۔ قرآن ایک ایسی چیز ہے، ایسی زندہ جاوید کتاب ہے اور ایسی جوان اور زندگی سے بھرپور ہے کہ جو اس سے جڑ جائے گا، جوان ہو جائے گا، صاحب بصیرت ہو جائے گا۔ انقلاب اسی قرآن کی روشنی میں پیدا ہوگا۔"

قرآن کریم کے متعلق مولانا کے یہ جملے کسی رسمی تقریر یا ڈپلومیٹک (Diplomatic) بیان کا حصہ نہیں ہیں بل کہ یہ وہ ارشادات وہدایات ہیں جو وہ اپنے مرشدین کو دیا کرتے تھے۔ خود بھی بہ کثرت قرآن کی تلاوت کرتے تھے، اس کے تراجم وتفاسیر پر نظر رکھتے تھے

اور اپنے وابستگان کو بھی اس کا حکم دیتے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ''قرآنی افادات'' کو اپنی رہ نمائی میں جمع کرا کے ضخیم کتاب کی شکل میں شائع کرنا، ان کے اسی ربط بالقرآن کا نتیجہ ہے۔ صاحب قرآن جل وعلا کو اپنے اس بندے کا قرآن سے یہ ربط اتنا پسند آیا کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس کے کانوں میں جو آواز پڑ رہی تھی، وہ ''قلب قرآن'' یعنی سورۂ یٰس کی تھی۔

شرک و بدعت سے نفرت

مولانا عبداللہ حسنی تصوف کی تاریخ پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ انھیں اس بات کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ تصوف کے پاکیزہ ماحول میں گھس آنے والی کالی بھیڑوں نے اپنی جہالت سے پورا ماحول مسموم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے وہ اکرام شیخ اور تعظیم شیخ کی حدود کو اتنی ہی وسعت دیتے تھے جتنی کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس سے زیادہ تکریم و تعظیم کے قائل نہ تھے۔ وہ ہر وقت شیخ کے تذکرے، شیخ کی تعظیم اور اس کے لیے غیر محتاط القاب و آداب استعمال کرنے کو شرک و بدعت کا چور دروازہ سمجھتے تھے۔ شرک و بدعات سے نفرت مولانا کو ورثے میں ملی تھی۔ اپنے جد امجد سید الاتقیاء سید شاہ علم اللہ حسنی سے لے کر اپنے مرشد مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تک ایک ایک شخص کو شرک و بدعات سے حد درجہ دور اور مشرکانہ رسوم و رواج سے سخت متنفر دیکھتے آئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ اپنی تقریروں اور دروس میں شرک کا تذکرہ کرنے لگتے تو ان کے انداز بیان اور چہرے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ کسی غلاظت کے ڈھیر کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہوں۔ اپنے مسترشدین کو بھی وہ بار بار توحید خالص اور بدعات سے دور رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا:

> ''شرک پیشاب پاخانے کی طرح ہے۔ جس طرح سے ایک کلو دودھ میں پچاس گرام پیشاب یا پاخانہ ڈال دیں تو بھی دودھ ضائع ہو جائے گا اور آدھا کلو ڈالیں تب بھی دودھ گیا اور اس کی بدبو بھی چاروں طرف پھیل جائے گی۔

اسی لیے قرآن شریف میں فرمایا گیا کہ اللہ کے ساتھ اتنا بھی شرک نہ کرو۔ شیأ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی ذرا بھی شرک نہ کرو۔ بعض لوگ اپنے سیاسی یا دنیوی مفاد کے لیے کر بیٹھتے ہیں کہ یہ شرک کہاں ہے؟ ہم نے تو فلاں مصلحت کی وجہ سے ذرا سا کر لیا۔"

اتباع سنت کی تاکید

توحید کے بعد مولانا اپنے مریدین کے لیے جس چیز کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے تھے وہ تھی کامل اتباع سنت۔ سنتوں کے معاملے میں وہ بے حد حساس تھے۔ کسی چھوٹی سے چھوٹی سنت کو کم تر سمجھ کر چھوڑنا انھیں گوارا نہ تھا۔ سنت نبوی کی محبت دل میں پیدا کرنے کے لیے وہ مسلسل سیرت نبوی کا مطالعہ کرنے کو لازم سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ سیرت آئے گی تو سنت کی محبت پیدا ہوگی اور سنت آئے گی تو بدعات مٹ جائیں گی۔ ایک مرتبہ دہلی میں انتہائی قیمتی بات ارشاد فرمائی تھی:

"بہت سے لوگ بعض سنتوں کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سنت ہی تو ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں زیادہ روشنی ہوتی ہے وہاں چھوٹی چھوٹی چیز بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح جس کے دل میں ایمان کا نور بہت زیادہ ہوتا ہے وہ ایک ایک سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جہاں یہ نور کم ہوتا ہے وہ سنتوں کو چھوٹا سمجھ کے چھوڑتا رہتا ہے۔"

کامل اتباع سنت کی دعوت

سنتوں کے معاملے میں مولانا اکثر یہ ہدایت بھی فرماتے تھے کہ سنت کو چند اعمال وافعال تک محدود کرنا گم راہی کا سبب بنتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک مرتبہ فرمایا:

"اتباع سنت کو بھی لوگوں نے محدود کر دیا ہے۔ اکثر لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ داڑھی ایک مشت ہو جائے اور ٹخنے سے اوپر پاجامہ، بس ختم۔ بھائی! اتباع سنت کا مطلب ہے ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی تمام

سنتوں پر عمل کرنا۔ جیسے کبوتر کے دونوں پر کاٹ دیے جائیں تو اڑ نہیں پائے گا۔ لیکن کبوتر کے اندر جان ہی نہیں، تو وہ چاہے کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو، کیسے ہی پر کیوں نہ ہوں، کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح جن کے اندر باطنی سنتوں کا اتباع نہیں ہے انھیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے بغیر کچھ نہیں ہونے والا۔ ظاہری طور پر دیکھنے میں بڑے متبع سنت ہیں اور دل میں گندگی بھری ہوئی ہے۔ جب تک باطن ٹھیک نہیں ہوگا اور باطن کی سنتوں پر عمل نہیں کریں گے تب تک ہمارے اندر حقیقی اتباع سنت پیدا نہیں ہو سکتی۔

احوال صحابہؓ کے مطالعے کی ترغیب

سنت نبوی اور سیرت مطہرہ کے ساتھ ساتھ مولانا عبداللہ حسنی صحابۂ کرام کی مقدس جماعت سے ربط و تعلق کو اصلاح نفس کا اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ صحابۂ کرام کے تذکروں کا مطالعہ کرنے پر بہت زور دیتے تھے۔ صحابہ کے فہم دین کو امت میں رائج کر دینا ان کے نزدیک ایک بڑا کارنامہ بھی تھا اور تمام مسائل کا حل بھی۔ وہ فرماتے تھے کہ امت کی کج فکری اور دین کا محدود تصور صحابۂ کرام کے حالات اور تعلیمات سے دوری کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے ان کے ذہن میں صحابۂ کرام کے فہم دین اور اعتدال و توازن کو واضح کرنے والے ملفوظات و واقعات کو جمع کرنے کا خاکہ بھی تھا۔ مولانا کے بھانجے مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی (معاون مدیر پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ) نے بیان کیا ہے:

> ''صحابۂ کرام کی سیرت کا وہ پہلو جو ان کے اسلام لانے اور اس کی خاطر قربانیاں پیش کرنے کا ہے اس پر کام کرنے کے لیے آپ نے مولوی عبدالعلیم ندوی مقیم کلکتہ کو متوجہ کیا اور دو جلدوں میں انھوں نے یہ کام انجام دیا۔ افسوس کہ آپ کی زندگی میں طبع نہ ہو سکا۔ ایک کام صحابہ کی زندگی کا ان کے ذہن میں خوب آیا کہ ان کے اقوال و ملفوظات میں سے تربیتی پہلو کے حامل ملفوظات کو جمع کیا جائے، تاکہ توازن و اعتدال امت میں جو کم ہوتا جا رہا ہے اس کو صحیح رخ پر لایا جائے۔ مثال کے طور پر حضرت ابوالدرداءؓ نے دمشق، شام سے حضرت

سلمان فارسیؓ کو مکتوب بھیجا کہ یہاں تشریف لائیے، یہ جگہ مقدس ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے بڑا حکیمانہ جواب دیا کہ مقامات مقدس نہیں بناتے ہیں، اعمال مقدس بناتے ہیں۔ اس طرح اور حکیمانہ اقوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے خال معظمؒ نے راقم الحروف کو متوجہ کیا کہ وہ ملفوظات صحابہ پر کام کرے اور اسی نام وعنوان سے اس کو منظر عام پر لائے۔"(۱)

ملفوظات کے متعلق محتاط رویہ

سلف صالحین اور اولیاء کرام کے ملفوظات ومواعظ کے سلسلے میں بھی مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نہایت مضبوط اور معتدل رویہ رکھتے تھے۔ وہ نہ تو ملفوظات ومواعظ کو قرآن وحدیث اور سیرت اور حالات صحابہ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور نہ ان کو غیر اہم سمجھتے تھے۔ وہ ہر چیز کو اس کے اصل مقام پر رکھنے کے قائل تھے۔ انھیں اس بات کا بھی بہ خوبی اندازہ تھا کہ بزرگان دین کے حالات اور ملفوظات کے نام پر غیر معتبر کتابوں کا ایک پورا دفتر تیار ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ ملفوظات اور بزرگوں کے حالات کے معاملے میں بھی محتاط رہتے تھے اور اپنے مریدین کو بھی احتیاط کی تاکید کرتے تھے۔ متقدمین میں وہ پیرانِ پیر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی کے خطبات ومواعظ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ دورِ آخر کے بزرگوں میں وہ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی اور ان کے خلفاء کے ملفوظات ومکتوبات کا مطالعہ لازم سمجھتے تھے۔ بالخصوص مکتوبات امام ربانی، سے انھیں خصوصی شغف تھا۔ مجدد الف ثانی کے ان مکتوبات کو وہ اہل تصوف کے اندر اعتدال و توازن پیدا کرنے کے لیے انتہائی مفید سمجھتے تھے۔ مکتوبات امام ربانی سے ان کی وابستگی ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے مکتوبات کا انتخاب تیار کیا تھا، جس کو اپنی مجلسوں میں پڑھوا کر سنتے بھی تھے۔ ان کی بہت کم تقریریں ایسی ہوں گی، جو مکتوبات کے حوالوں سے خالی ہوں۔ بیسویں صدی کے بزرگوں میں وہ امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی،

---

(۱) ماہ نامہ پیام عرفات، خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی، ص:۱۲۶

مولانا شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا شاہ فضل رحماں گنج مرادآبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ سید سلیمان ندوی، شاہ محمد یعقوب مجددی اور مولانا عبدالباری ندوی کے ملفوظات، مکتوبات اور تصوف کے متعلق ارشادات کے مطالعے پر زور دیتے تھے۔ ماضی قریب میں مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی، مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی، مولانا شاہ ابرارالحق حقی، شاہ حکیم محمد اختر (کراچی) اور حال کے بزرگوں میں مولانا شاہ محمد قمرالزماں الٰہ آبادی کے ملفوظات اپنی مجلسوں میں پڑھوا کر سنتے بھی تھے اور مریدین کو بھی ان کے مسلسل مطالعے کا مشورہ دیتے تھے۔ غرض یہ کہ مولانا کے ہاں سلف صالحین کے حالات اور اولیاء کرام کے ملفوظات و مواعظ کا اہتمام تو تھا لیکن احتیاط کے ساتھ۔ کیوں کہ وہ اس سلسلے میں بداحتیاطی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مفاسد پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی (آکسفورڈ یونی ورسٹی، لندن) نے تصوف کے سلسلے میں مولانا کے معتدل رویے اور اپنی معتدل رایوں پر استقامت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''مولانا عبداللہ حسنی مرحوم کی ایک اہم خصوصیت جس کا ہمہ وقت تجربہ ہوتا، وہ افکار و خیالات کی پختگی تھی۔ جب کہ میں ندوے کی روایت کے مطابق آزادی کے ساتھ متقدمین و متاخرین کی تحریروں کا مطالعہ کرتا اور آپ سے ہر روز کسی نہ کسی نئے موضوع پر گفتگو ہی نہیں بل کہ بحث و مباحثہ رہتا، اس زمانے میں ابن حزم ظاہری، ابن قیم اور ابن تیمیہ کی کتابوں کا خصوصی مطالعہ کرتا تھا اور میرے خیالات ہر دن بدلتے رہتے تھے، آپ سادہ دلی سے میرے سوالوں کا جواب دیتے اور فرماتے کہ ابھی پختگی آنے میں وقت لگے گا۔ بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ جن موضوعات پر میں آپ سے بحث کرتا تھا ان میں سے زیادہ تر میں آپ کی رائے صحیح رہتی تھی۔
>
> آپ کی صحبت سے تصوف و حقیقت کے بہت سے پہلو منکشف ہوئے، بالخصوص علم و تصوف کے درمیان معتدلانہ راہ روی کی معرفت مجھے آپ کے ذریعے حاصل ہوئی۔''(۱)

---

(۱) ماہ نامہ پیام عرفات، خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی، ص:۶۹

خلاصۂ کلام یہ کہ داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی تصوف میں انتہائی معتدل رائے رکھتے تھے۔اس پر خود بھی عمل کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے۔ یہ وہی تصوف تھا جو انھوں نے قرآن کریم، احادیث مطہرہ، آثار صحابہ اور سلف صالحین کے مستند اقوال و مواعظ سے اخذ کیا تھا۔جس میں بدعات و خرافات کی کوئی جگہ نہ تھی۔

(۲) خطابت

تقریر و خطابت ایک فن ہے، جو کچھ انسانوں کو فطری اور پیدائشی طور پر عطا کیا جاتا ہے۔جس کی فطرت میں خطابت کا ذوق ہوتا ہے، وہ میدان خطابت میں پہلے ہی دن سے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کرنے لگتا ہے اور جس کے اندر فطری طور پر یہ ذوق نہیں پایا جاتا، وہ ہزار تقریریں رٹ کر بھی عوام کو متاثر نہیں کر پاتا۔اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ خطابت فن کے بہ جائے، نعمت خداوندی اور عطائے الٰہی ہے۔وہ جس کو چاہے عطا کردے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو عطا نہیں کی گئی اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو نوازدی گئی۔بل کہ یہ خطابت اور بہترین انداز سے اپنی بات بیان کرنے کا فن ہی ان کے لیے تاج نبوت کا سبب بنا۔

خطابت میں عام طور پر دو انداز پائے جاتے ہیں۔ایک شعلہ بیانی کا اور دوسرا شبنم فشانی کا۔پہلے میں ہنگامہ خیزی ہوتی ہے اور دوسرے میں سادگی۔یہ دونوں ہی انداز خطابت اپنی اپنی جگہ متاثر کن ہیں۔فرق اتنا ہے کہ پہلے میں اثرات زائل ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔جب کہ دوسرے میں اثرات زائل نہ ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں پہلے انداز خطابت کا ایک نمونہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (ولادت: ۱۸۸۸ء، وفات: ۱۹۵۷ء) کے خطبات ہیں اور دوسرے انداز خطابت کا نمونہ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی کے خطبات۔دونوں کی تقریروں نے اپنے اپنے وقت میں عوام پر گہرا اثر ڈالا۔لیکن آج مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریریں اصلاح حال کے بہ جائے ادبی چاشنی کا کام زیادہ کرتی ہیں۔جب کہ مولانا قاری محمد طیب قاسمی کے خطبات کے ذریعے

آج بھی اصلاح وارشاد کا کام انجام پا رہا ہے۔ خطابت کے متعلق اس تمہید کی ضرورت اس لیے پڑی کہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی خطابت کو صحیح انداز سے سمجھا جا سکے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کے والد، دادا، پردادا اور اس سے اوپر بھی کوئی باقاعدہ مقرر نہیں تھا۔ یوں علم وتقوے کے حامل تو سب تھے اور موقع پڑنے پر وعظ ونصیحت کا فریضہ بھی انجام دے لیتے تھے لیکن ایسا مقرر، جس کو ایک مستقل مقرر کی حیثیت سے اجتماعات اور جلسوں میں دعوت دی جاتی ہو، ایسا کوئی نہ تھا۔ مولانا کے والد مولانا سید محمد الحسنی، ان کے والد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، ان کے والد علامہ حکیم سید عبدالحئی حسنی اور ان کے والد حکیم فخر الدین خیالی وغیرہم سب کے سب اپنے اپنے مزاج کے مطابق علمی ودینی خدمات میں مشغول رہنے والے خاموش طبیعت انسان تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں کئی دہائیوں تک مسلسل خطابت کے ذریعے اپنے تمام آباء واجداد کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ ان ہی کے طرز پر چلتے ہوئے مولانا عبداللہ حسنی نے بھی میدان خطابت سے مسلسل رابطہ رکھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مولانا نے خطابت کا بالکل الگ انداز اختیار کیا تھا، جو ان کے چھوٹے دادا اور مرشد ومربی مولانا سید ابوالحسن ندوی سے بھی بہت مختلف تھا۔ ہم ان کی خطابت کے گوشوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

شوق نہیں ضرورت

بزرگان دین اور سلف صالحین کے ہاں ہمیشہ سے معمول رہا ہے کہ انھوں نے خطابت کو اپنی عظمت وبڑائی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بل کہ اس طرح کی بے شمار واقعات بھی ملتے ہیں کہ ان میں سے کسی بزرگ کو اگر یہ محسوس ہو گیا کہ فلاں جگہ تقریر کرنے سے اس کی واہ واہی ہوگی اور لوگ اس کے انداز خطابت کو داد وتحسین سے نوازیں گے، تو اس نے تقریر کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہمارے ہاں بھی بزرگان دین کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ اپنے تلامذہ اور مریدین میں سے جس کو زیادہ تقریریں کرتے دیکھتے، اسے یا تو خطابت کا سلسلہ پورے

طور سے موقوف کردینے کا حکم دیتے یا کچھ شرائط کے ساتھ اجازت دیتے۔ کیوں کہ مقرر جب مجمع کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ سیکڑوں ہزاروں لوگ اس کو سننے بیٹھے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہیں تو ایسی صورت میں نفس کو پھولنے کا پورا موقع مل جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت اس شخص کی باتوں سے سامعین متاثر ہوں لیکن اس کے دل میں آنے والی بڑائی اس کی بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ مولانا عبداللہ حسنی ندوی بھی ان علماء ربانیین میں سے تھے، جنھوں نے نہ تو خطابت کو آمدنی کا ذریعہ بنایا اور نہ تقریروں سے اپنی دل چسپی کا اظہار کیا۔ ان کے نزدیک خطابت کا اصل مقصد پیغام پہنچانا تھا۔ کسی جگہ اگر وہ محسوس کرتے کہ وہاں صرف رسمی باتیں ہونی ہیں تو شرکت سے صاف منع کردیتے تھے۔ ایسے جلسوں سے انھیں سخت وحشت تھی، جہاں شان دار ہال یا شامیانے میں، بلند و بالا اسٹیج پر بیٹھ کر گفتگو تو کرنی ہو لیکن اس پروگرام کا موضوع رسمی سا ہو اور وہاں موجود عوام صرف رسمی طور پر گفتگو سننے آئی ہو۔ ان کا اصل مقصد پیغام پہنچانا ہوتا تھا، اپنی خطابت یا مقام و مرتبے کا رعب گانٹھنا نہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

دہلی کے مشہور علاقے ''دوارکا'' میں اصحاب ثروت کی ایک مشہور سوسائٹی کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو فرمانی تھی۔ انھوں نے مولانا عبداللہ حسنی کو اپنی جگہ بھیجا تھا۔ مہمانِ خصوصی دہلی کی وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت تھیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ وزیر اعلیٰ کئی گھنٹے کے عوامی پروگرام میں موجود نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے جلسے میں آئیں۔ مولانا عبداللہ حسنی صدارت فرما رہے تھے۔ صدر کی تقریر معمول کے مطابق اختتام ہی میں ہونی تھی۔ عام حالات میں کرسی صدارت کو انتہائی شرف و اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا نے کسی شرف و اعزاز اور صدارت کی پرواہ کیے بغیر منتظمین جلسہ سے اصرار کرکے اپنی تقریر پہلے کروالی۔ وزیر اعلیٰ کو کچھ دیر بیٹھ کر واپس جانا تھا، اس لیے مولانا کو تقریر کے لیے صرف دس، پندرہ منٹ کا وقت ملا۔ مولانا اس پر بھی راضی ہوگئے۔ وزیر اعلیٰ آکر بیٹھ گئیں تو آغاز ہی میں مولانا کو تقریر کے لیے بلالیا گیا۔

انھوں نے چند منٹ میں سیرت رسول کی روشنی میں حکم رانوں کو ان کی ذمے داریاں یاد دلائیں اور کافی سخت الفاظ استعمال کر کے اپنی ذمے داریاں ادا نہ کرنے پر دنیوی و اخروی عذاب سے ڈرایا۔ پندرہ منٹ سے پہلے اپنی گفتگو ختم کی اور دوبارہ کرسی صدارت سنبھال لی۔ پھر پوری یک سوئی اور متانت کے ساتھ آخر تک موجود رہے اور تمام مقررین کو بڑی دل چسپی سے سماعت فرماتے رہے۔ جلسے کے بعد ملاقات ہوئی اور میں نے وزیر اعلیٰ کے سامنے نہایت مناسب گفتگو کا تذکرہ کیا تو مولانا نے بھی یہ موقع ہاتھ آنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اپنے مخصوص انداز میں وضو کے لیے آستین اوپر چڑھاتے ہوئے فرمایا: ''ہم نے بھی سوچا بغیر سنائے نہ جانے دیں۔ موقع مل گیا تو سنا دیا۔ ورنہ یہ لوگ ہاتھ نہیں آتے۔'' مولانا کا یہ اقدام صرف اس لیے تھا کہ وہ اپنی بات پہنچا دیں۔ صدارت، اختتامی تقریر اور اسٹیج کی پینترے بازیوں سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ یہی معاملہ خالص دینی جلسوں میں بھی ہوتا تھا۔ جہاں وہ محسوس کرتے تھے کہ کچھ مال دار، سیاسی رہ نما یا سیاست زدہ علماء اپنے مفاد کے لیے بھیڑ جمع کر رہے ہیں اور دینی جلسوں کو استعمال کرنا چاہتے ہیں، ایسے جلسوں میں شرکت سے وہ پوری طرح گریز کرتے تھے۔ بل کہ قدرے کراہت کا اظہار فرماتے تھے۔

درمیانی اندازِ خطابت

پیچھے ہم دو انداز خطابت کا تذکرہ کر آئے ہیں۔ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا انداز خطابت ان دونوں کے درمیان کا تھا۔ وہ نہ تو صرف شیر کی طرح دہاڑتے تھے اور نہ صرف کوئل کی طرح میٹھے میٹھے انداز میں کوکتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان انھوں نے اپنی ایک الگ راہ بنائی تھی۔ نہایت پروقار انداز میں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ خطبۂ مسنونہ اور آیات و احادیث سے بات شروع کرتے تھے اور پھر قدرے مسکراہٹ کے ساتھ اپنی گفتگو آگے بڑھاتے تھے۔ میٹھے میٹھے انداز میں انتہائی پُرحکمت باتیں بیان کرتے جاتے۔ اکثر مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی کے اشعار بھی پڑھتے اور اس انداز سے مزے لے لے کر

پڑھتے کہ تقریر ختم ہونے کے بعد مجمع کے اکثر افراد کی زبان پر پورا شعر یا ایک آدھ مصرع ضرور ہوتا۔ بیچ بیچ میں مختلف بزرگوں کے واقعات بھی سناتے چلتے۔ دوران تقریر عام طور پر مکتوبات امام ربانی کے حوالے دیتے اور امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید اور ان کے قافلے کا تذکرہ کرتے۔ اپنے چھوٹے دادا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی کا ذکر کرتے تو بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں کہتے "ہمارے حضرت مولانا فرمایا کرتے تھے۔"

بیسویں صدی کے ہندستانی علماء میں شاہ فضل رحماں گنج مراد آبادی کی اتباع سنت اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی عقیدۂ توحید سے حد درجہ وابستگی کے واقعات بھی اہتمام کے ساتھ سناتے چلتے۔ تقریر کرتے کرتے کسی مشرکانہ یا مبتدعانہ رسم ورواج کا تذکرہ آجاتا تو مولانا کا جوش وجذبہ دیدنی ہوتا تھا۔ خلاف معمول بہت بلند آواز میں گفتگو کرنے لگتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی استاد ومربی کسی شاگرد کی گھٹیا حرکت پر اس کے مستقبل پر سخت خطرہ محسوس کرتے ہوئے غصے میں آپے سے باہر ہو رہا ہے اور اسے آنے والے خطرات سے ڈرا رہا ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا کہ مولانا بیٹھے بیٹھے تقریر کر رہے ہیں اور مفاسد کا تذکرہ آیا تو کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے مواقع پر پورا مجمع ہیبت کے سے ماحول میں چلا جاتا اور خود کو تباہی کے دہانے پر محسوس کرنے لگتا۔ یہ صرف مولانا کا اخلاص اور درد دل تھا جو چھلک جاتا تو اندر موجود درد وغم کے طوفان کی ایک جھلک سی دکھا جاتا تھا۔

وقت کی پابندی

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ مقررین وواعظین کئی کئی گھنٹے تقریر کرنے کو نہ صرف یہ کہ فخر سمجھتے ہیں بل کہ اگر وقت محدود کر دیا جائے تو ناراضی کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ دہلی میں ایک معروف شخصیت کو دیکھا کہ جب انھیں کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر وقت ختم ہونے کی یاد دہانی کرائی گئی تو انھوں نے بڑی غضب ناک نظروں سے ناظم جلسہ کو دیکھا اور پرچی ہوا میں اڑا دی۔ دہلی ہی میں ایک مقرر کو جب ناظم جلسہ نے (جو ان کے پرانے دوست بھی تھے) پرچی تھمائی تو انھوں نے اسے اپنی توہین محسوس کیا اور تقریر روک کر غصے

بھرے انداز میں پرچی پر لکھی عبارت عوام کو سنائی اور اسٹیج چھوڑ کر چلے گئے۔ بہت سے مقررین اپنے ساتھ رہنے والوں کی اس انداز سے تربیت کرتے ہیں کہ جب ناظم جلسہ انھیں وقت ختم ہونے کی اطلاع دینے کے لیے بڑھے تو وہ اسے روک دیں تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہیں تقریر ختم کریں۔ اس کے برعکس رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام، صحابۂ کرام، سلف صالحین اور ماضی قریب وحال کے مستند علماء وقت کی پابندی کو اپنے لیے ناگزیر سمجھتے رہے ہیں۔ ماضی قریب میں مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق حقی خطابت میں پابندیٔ وقت کی بڑی روشن مثالیں ہیں۔ یہی معاملہ داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا بھی تھا۔ مولانا کا رویہ عام مقررین کے رویے سے بالکل الگ دیکھا۔

۲۰۰۷ء میں جامعہ خیر النساء (للبنات)، نئی دہلی (جس کے ناظم اعلیٰ خود مولانا تھے) کے اولین جلسۂ تقسیم اسناد میں صدارتی تقریر مولانا کی تھی۔ جلسہ ختم ہونے میں پون گھنٹہ باقی تھا اور مقرر صرف مولانا تھے۔ میں نے مولانا کو دعوت دی اور مولانا اپنی نشست سے اٹھ کر ڈائس پر تشریف لائے۔ تقریر شروع کرنے سے پہلے مائک پر کھڑے کھڑے مجھ سے پوچھا ''کتنی دیر بولنا ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''وقت ہے، آپ آرام سے گفتگو کریں۔'' کوئی اور ہوتا تو خوشی خوشی تقریر شروع کر دیتا۔ لیکن مولانا کوئی پیشہ ور یا شوقیہ مقرر نہیں تھے۔ وہ تو ایک مربی وداعی تھے۔ انھوں نے مائک پر کھڑے ہونے کے باوجود تربیت کا پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ فرمایا: ''نہیں، یہ غلط بات ہے۔ وقت متعین ہونا چاہیے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''آپ آدھے گھنٹے گفتگو فرمالیں۔'' مسکرائے اور فرمایا: ''ہاں، اب ٹھیک ہے''۔ اس کے بعد تقریر کی اور آدھے گھنٹے میں ختم کر دی۔ اس جلسے میں کی گئی تقریر کو آج تک بہت سے ایسے لوگ بھی یاد کرتے ہیں، جو سلف وخلف سب سے شاکی رہتے ہیں اور کسی کو کچھ نہیں گردانتے۔

جو لوگ دینی جلسوں کے ماحول سے واقف ہیں وہ مولانا عبداللہ حسنی کے اس

روپے پر خراج عقیدت پیش کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ وہی لوگ صحیح طور پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ خطابت کے سلسلے میں مولانا کے یہ تمام معمولات کس قدر اہمیت کے حامل ہیں۔ دراصل یہ سب اس لیے تھا کہ مولانا کے نزدیک خطابت کوئی پیشہ یا شوق نہیں تھا بلکہ وہ اسے رب کریم کا ایک عطیہ سمجھتے تھے اور صرف اسی کی رضا کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ نہ وہ تقریروں کا معاوضہ لیتے تھے، نہ اپنی طرف سے اعلیٰ درجے کے ٹکٹ کی فرمائش کرتے تھے اور نہ مقررین کے درمیان کسی خاص مقام پر تقریر کرنے پر اصرار کرتے تھے۔ جہاں ضرورت سمجھتے اور فائدہ دیکھتے وہاں تشریف لے جاتے، کوئی معاوضہ دیتا تو منع کر دیتے، وہ اصرار کرتا تو ناراض تک ہو جاتے، وہ جس طرح کی آمد و رفت کا انتظام کرتا اسے خوشی خوشی قبول کر لیتے اور جب جتنی دیر تک تقریر کرنے کو کہا جاتا، تقریر کر لیتے۔ مقصود صرف یہ ہوتا کہ لوگوں تک دین کی بات کر کر رب کو راضی کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

(۳) تحریر

خانوادۂ علم اللہی کی وہ شاخ جس سے مولانا عبداللہ حسنی ندوی کا تعلق تھا، مصنفوں اور اصحاب قلم کے خاندان کی حیثیت سے مشہور تھی۔ ماضی میں حکیم سید فخر الدین خیالی سے لے کر حال میں مولانا سید بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی تک اصحاب قلم کا ایک سلسلہ ہے۔ سب نے اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق کم یا زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلے کی بہت سی اہم کتابیں ایسی بھی ہیں جو اب تک شائع نہ ہو سکیں۔ مصنف نے لکھیں اور وہ خاندانی مخطوطات میں شامل ہو گئیں۔ کیوں کہ لکھنے والے نے اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق لکھا، طباعت و اشاعت کی فکر نہیں کی۔ بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے اردو و عربی کے کتب خانوں میں ایک اضافہ کیا۔ لیکن یہاں مولانا عبداللہ حسنی کے باپ دادا کا ذوق تصنیف و تحریر موضوع گفتگو نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا کے اجداد میں سے بیش تر کا قلم کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا عبداللہ حسنی اپنے دادا مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سے بچپن میں بہت قریب رہے۔ پیچھے بھی یہ بات عرض کی

جا چکی ہے کہ ڈاکٹر صاحب غیر مسلموں میں دعوت کے کام پر بڑا زور دیتے تھے۔ اگر چہ ان کی وفات کے وقت مولانا عبداللہ حسنی چار پانچ سال کے تھے لیکن غیر محسوس طریقے سے ان کی شخصیت پر اپنے دادا کے انداز تربیت اور سوچ کے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوتی فکر کو سب سے زیادہ مؤثر انداز میں مولانا عبداللہ حسنی لے کر اٹھے اور غیر مسلموں میں دعوت کا بڑا کام انجام دیا۔ یہاں ہمیں ڈاکٹر صاحب اور مولانا عبداللہ حسنی کے درمیان ایک اور مماثلت نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ مولانا عبداللہ حسنی سے اوپر کے چار پانچ بزرگوں میں تصنیف و تالیف سے سب سے کم مناسبت ڈاکٹر صاحب ہی کو رہی۔ ان کا اصل زور افراد سازی اور تربیت پر ہوتا تھا۔ تربیت کے معاملے میں وہ غیر مقلد تھے۔ بل کہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مجتہد تھے۔ ان کے اس اجتہادی اندازِ تربیت کے دو نمونے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سید محمد حسنی دنیا کے سامنے آئے اور اچھے اچھوں سے لوہا منوالیا۔ مولانا عبداللہ حسنی کے مزاج میں اپنے دادا کا یہ ذوق بھی منتقل ہوا تھا۔ انھیں بھی تصنیف و تالیف سے بہت کم مناسبت رہی اور سارا زور افراد سازی پر صرف ہوا۔ ان کی تربیت کے کچھ نمونے سامنے آچکے ہیں اور کچھ مستقبل میں آنے باقی ہیں۔

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نے اصلاح و تربیت کے لیے بیعت و ارشاد اور خطابت کے ساتھ جو تیسرا راستہ اختیار کیا تھا، وہ تحریر کا تھا۔ البتہ تحریری میدان میں عربی کا حصہ اردو سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا ندوے سے نکلنے والے جریدے ''الرائد'' کے نائب مدیر تھے۔ اصولی طور پر اس کے مدیر مسئول ان کے چھوٹے چچا مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی تھے۔ لیکن الرائد کے دفتر میں بیٹھنا اور تمام ذمے داریاں ادا کرنا مولانا ہی کا کام تھا۔ الرائد کا اپنا ایک نظام ہے۔ ہر شمارے میں ''کلمۃ الرائد'' کے عنوان سے مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی تحریر ہوتی ہے۔ جب کہ پہلے شمارے میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، دوسرے میں مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کا اداریہ ہوتا ہے۔ تیسرے شمارے میں مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی اداریہ لکھا کرتے تھے۔ ابتداء میں یہ

بات آ چکی ہے کہ مولانا کو مضمون نگاری اور تحریر کی مشق کا بڑا قیمتی موقع ہاتھ آیا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مولانا محمد الحسنی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، اور مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی جیسے عربی زبان وادب کے ماہرین اور برصغیر میں عربی صحافت وانشاء پردازی کے اساطین سے استفادے کے بھرپور مواقع میسر آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تحریریں ظاہری اعتبار سے بھی دل کش ہوتی تھیں اور معنوی اعتبار سے بھی دامن کش ہوتی تھیں۔ مولانا کی ان تحریروں سے طلباء مدارس بھی مستفید ہوتے تھے اور علماء کرام بھی محظوظ ہوتے تھے۔ برصغیر میں اس وقت عربی زبان و ادب کے رمز شناس کی حیثیت سے سب سے بڑا نام مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا ہے۔ وہ مولانا عبداللہ حسنی کی تحریری صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''مولوی عبداللہ حسنی ندوی مرحوم کا امتیاز صرف ان کی دعوتی کوشش ہی کا نہیں ہے بل کہ علمی وادبی لحاظ سے بھی وہ بڑا امتیاز رکھتے تھے۔ عربی تحریر اور مضمون نگاری میں ان کے دادا کے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو بین الاقوامی سطح پر جو امتیاز حاصل تھا، جس کو تقریباً ان کے بھتیجے مولوی عبداللہ حسنی کے والد مولانا سید محمد الحسنی نے اپنالیا تھا، اس کی پوری جھلک مولوی عبداللہ حسنی کے قلم میں آ گئی تھی۔ عربی پندرہ روزہ الرائد کے جو اداریے وہ لکھتے تھے، اس میں وہ صاف محسوس کی جاتی تھی۔''(۱)

اسی طرح مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے لکھا ہے:

> ''مولانا سید عبداللہ حسنی مرحوم کو عربی زبان وادب پر کافی عبور تھا۔ وہ چاہتے تو اپنے والد محترم کے قائم کیے ہوئے عربی مجلے البعث الاسلامی کے مدیر ہوتے اور یہ ان کا آئینی حق ہوتا۔ لیکن اس جانب انھوں نے توجہ نہیں کی اور بزرگوں کے مشورے اور حکم کے مطابق پندرہ روزہ عربی اخبار الرائد کے نائب مدیر رہنے پر اکتفاء کیا اور یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے برابر اس ذمے داری کو انجام دیتے رہے اور اس میں اپنے عربی مضامین شائع کراتے رہے۔ وہ اکثر افتتاحیہ بھی خود ہی

(۱) ماہ نامہ پیام عرفات خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی ص:۱۴، ۱۵

لکھتے تھے اور اپنے اسلاف کے نہج پر چل کر دعوتی اسلوب میں جدید ذہن کو مخاطب کرتے تھے۔ انھوں نے تاحیات اس خدمت کو بہ احسن وجوہ انجام دیا۔ البعث الاسلامی میں بھی ان کے بہت سے عربی معیاری مضامین شائع ہوئے۔ ان کو اردو زبان وادب سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ اردو میں کافی مضامین لکھے اور وہ تعمیر حیات و دیگر اردو رسالوں کی زینت بنے۔ انھوں نے اپنے جد معظم حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے کئی عربی رسالوں اور مہتم بالشان عربی مضامین کے اردو ترجمے کیے اور وہ بڑے پیمانے پر اشاعت پذیر ہوئے۔ (۱)

عربی اسلوب تحریر

عربی تحریروں میں مولانا سلیس الفاظ اور آسان تراکیب استعمال کرتے تھے۔ بھاری بھرکم اور نامانوس الفاظ سے بات کو بوجھل نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہت گہری باتیں بیان کردیتے تھے۔ انداز بیان کی سادگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پڑھنے والا اکتا جائے اور اس کے جذبات میں کوئی ہنگامہ نہ برپا ہو۔ نہیں، بل کہ مولانا کی تحریروں اور اداریوں میں ایک تسلسل اور بہاؤ ہوتا تھا۔ بات آہستہ آہستہ اونچائی کی طرف بڑھتی تھی۔ سادہ الفاظ کے ساتھ عام فہم مگر پرزور الفاظ آتے جاتے تھے اور اس طرح پڑھنے والا مضمون میں غرق ہوجاتا تھا اور مضمون پورا کیے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ ہر مضمون کا مرکزی موضوع وہی نعرہ ہوتا تھا جو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے لگایا تھا۔ یعنی "شعارنا الوحید، إلى الإسلام من جديد" ایک مضمون میں علم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فالعلم الحقيقي الذي ينبلج منه النور، وينتشر منه الضياء، والذي يتفجر منه الماء العذب، هو العلم الذي يقطع منزله و يرتقي مناصبه العلياتحت الاسم الرباني، والمدد الصمداني، كماينبغي أن يتعلم هذا العلم عندالعلماء الراسخين لاعندالعلماء المنحرفين، وعند

(۱) ماہنامہ پیام عرفات خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی ص:۲۳

المشايخ الربانيين لا عند المشايخ المضللين، وعند العلماء العاملين المتدققين بالعلم والحيوية لاعند العلماء المتشدقين الثرثارين."

ان کی عربی تحریروں کی سلاست اور روانی کا اعتراف ان کے والد اور چھوٹے دادا کے تربیت یافتہ معروف ادیب مولانا نور عالم خلیل امینی (مدیر اعلیٰ ماہ نامہ الداعی واستاد ادب دارالعلوم دیوبند) نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"وہ تقریر اور گفتگو کی طرح اپنی تحریر میں بھی اپنی خوبیوں بھری شخصیت کا عکس تھے۔ اردو یا عربی میں جو کچھ لکھتے، اس میں الفاظ، ترکیبیں، جملے، جملوں کی بندشیں ہلکی، نرم اور ہر سطح کے قاریوں کے لیے "زود ہضم" ہوتیں۔ سچ ہے کہ تحریر وتقریر میں بھی انسان کے اخلاق وکردار کی پوری جھلک موجود ہوتی ہے۔ انسان وہی کچھ بولتا اور لکھتا ہے، جو اس کے اخلاق اس کو الہام کرتے ہیں۔"(۱)

مولانا کی عربی تحریروں کے متعلق ہم ملک کے ایک مایہ ناز عالم دین اور عربی زبان وادب کے اداشناس مولانا مفتی احمد خان پوری (شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات) کا ایک اقتباس بھی نقل کرتے ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنی تحریر میں مولانا کی عربی تحریروں کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ اس طرح ہمیں ایک باوقار شخصیت کا اعتراف بھی مل جائے گا اور مولانا کے طرز نگارش کا ایک نمونہ بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"والد محترم حضرت مولانا محمد الحسنی (کہ جن میں عربی اردو نثر نگاری کا ملکہ وہبی تھا) سے عربی اردو زبان وقلم ملے اور تاحین حیات اُن کا اشہبِ قلم مختلف موضوعات پر سرپٹ دوڑتا رہا۔ الرائد کی ادارت آپ کے حوالے رہی۔ اس مشہور رسالے کے توسط سے پرجوش مگر اخلاص وہم دردی سے بھرپور طریقے سے عربوں اور وابستگانِ الرائد کو جھنجھوڑتے رہے اور اپنا درد دل اور امت کی زبوں حالی انڈیلتے رہے اور ان کے علاج ومعالجات کے نسخے بیان کرتے رہے۔

"والد محترم کی طرح بعض اوقات عنوان اتنے عمدہ ہوتے کہ قاری عش عش

(۱) ماہ نامہ پیام عرفات خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی ص:۵۹

کرجاتا۔ مثلاً معالجة السقيم أوإسقام السليم ، حماقة العقلاء وجهالة العلماء ، عليكم بالثقلين أيها الثقلان."(۱)

مفتی صاحب نے مولانا کے مضامین کے دو اقتباسات بہ طور نمونہ پیش کیے ہیں۔ ہم ان میں سے صرف ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

"أصبح المسلمون في العالم المعاصر في العالم كله جسداً بلاروح، علماً بلايقين ، صورة بلا حقيقة، لهم أعلام مرفوفة علىٰ الأمم المتحدة، ولكنها منكسة في قلوب الأعداء، لهم عدد ها ئل في الدنيا ولكنهم غثاء كغثاء السيل، عند هم جواهر ولآلي ثمينة ولكنها تباع و تشترىٰ في سوق الغرب، لهم عقول ولكنها غسلت في الديار الغربية بماء نجس، عظمت جثتهم، وانتفخت أبدانهم بأدوية وأقراص تناولوها من مواليهم."

مولانا محمد الحسنی کے اسلوب تحریر سے واقفیت رکھنے والے گواہی دیں گے کہ اس اقتباس میں مولانا اپنے والد محترم کے اسلوب سے بہت قریب نظر آرہے ہیں۔ اس اقتباس میں روانی بھی ہے، سادگی بھی ہے، جوش و جذبہ بھی ہے، حالات سے واقفیت بھی ہے، زوال امت کا ماتم بھی ہے، زوال کے اسباب کا ادراک بھی ہے، زبان کی شائستگی بھی ہے، تراکیب اور جملوں کی چستی بھی ہے اور اسلامی ادبی ذخیرے سے استفادے کی علامات بھی ہیں۔ مولانا کی تحریروں میں اس طرح کے نہ جانے کتنے اقتباسات مل جائیں گے جن کو ہم ادبی شہ پارے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

اردو اسلوب تحریر

عربی زبان کے علاوہ مولانا نے اردو میں بھی حسب ضرورت مضامین لکھے ہیں۔

(۱) ماہنامہ پیام عرفات خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی ص: ۳۸، ۳۹

البتہ جیسا کہ عرض کیا گیا، اردو مضامین کا حصہ عربی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مولانا کے تحریر کردہ وہ اردو مضامین جو انھوں نے خود لکھے اور مستقل مضمون کی حیثیت سے لکھے، ان کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مولانا باقاعدگی کے ساتھ اس طرف رخ کرتے تو ان کے عربی ذخیرے کی طرح یہاں بھی ہمیں بہت کچھ ہاتھ آتا۔ لیکن وہ بے ضرورت مضامین اور کتابیں لکھنے کے سخت مخالف تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "آج کل پڑھے کم، لکھے زیادہ ہیں۔" یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "پہلے ایک کتاب ہزاروں لاکھوں لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتی تھی اور اب روزانہ ہزاروں کتابیں چھپتی ہیں، لیکن ایک کی بھی اصلاح مشکل ہی سے ہوتی ہے۔" یہ ان کا اپنا نقطۂ نظر تھا اور صد فی صد درست تھا۔ اس پر وہ خود بھی سختی سے کاربند تھے اور اپنے وابستگان کو بھی متوجہ کرتے تھے کہ بے ضرورت صرف نام و نمود کی غرض سے ہرگز مضامین و تصانیف شائع نہ کرائیں۔ ہاں، جب اور جس موضوع پر ضرورت محسوس کریں تو خوب مطالعہ کر کے مضبوط تحریریں شائع کریں۔ یہاں ہم مولانا کے اردو اسلوب تحریر کے صرف دو نمونے پیش کرتے ہیں۔

اپنے مخدوم و مربی بقیۃ السلف مولانا شاہ محمد احمد پرتاپ گڑھی سے اپنے تعلقات کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایک دن ہمارے مکان کے لب سڑک والے اس حصے میں، جو مطب کے لیے استعمال ہوتا تھا اور میٹنگ روم میں بھی بدل جاتا تھا، ایک بزرگ تشریف لائے۔ نحیف و لاغر جسم، قد قدرے دراز، مجاہدے اور ریاضت کے اثرات چہرے سے عیاں، تکلف اور "بزرگانہ اداؤں" سے دور، بل کہ نفور۔ محبت و شفقت کا پتلا، بل کہ سراپا محبت و سوز۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑھ کر استقبال کیا۔ حضرت والا ایک عام کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ والد صاحب اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ایک پیالی چائے کی حضرت کو پیش کی گئی۔ حضرت نے ایک دو گھونٹ پی اور بات شروع کر دی۔ بات کیا تھی، شہ پارے بل کہ شکر پارے تھے، جو کام و دہن میں رس گھول رہے تھے۔"(۱)

(۱) نمونۂ سلف، از مولانا شمس الحق ندوی، ص: ۱۹۱

اسی طرح اپنے مرشد و مربی مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے تصوف وسلوک پر لکھے گئے مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس فن میں حضرت کا کیا مقام تھا؟ یہ اہل مقام جانیں۔ چند باتیں اس کے تعلق سے عرض کردی گئی ہیں۔ کیفیات کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کردی گئی۔

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

کوئی ہشت پہل ہیرا کہتا ہے، کوئی مجموعۂ حسنات۔ کوئی پھولوں کا گلدستہ قرار دیتا ہے، کوئی قوس قزح۔ کوئی علم کا آفتاب کہتا ہے، کوئی عشق کا ماہ تاب۔ کوئی:

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

کہہ کر پکارتا ہے اور کوئی حکیم ودانائے راز۔ جس کے ہزار پہلو ہوں، سچ مدانوں کے لیے کسی ایک کا بھی حق ادا کرنا مشکل ہے۔ بازار میں اپنی پونجی لے کر یہ غریب بھی نام لکھانے آیا ہے۔ شاید اس کے حصے میں بھی کچھ آجائے اور دامانِ رحمت میں جگہ پانے کا مستحق ہوجائے۔''(۱)

ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں رہ جاتا کہ اگر مولانا عبداللہ حسنی ضرورت سمجھتے اور اردو مضمون نگاری اور انشاء پردازی کی طرف توجہ کرتے تو یقیناً وہ دھلی دھلائی نثر وجود میں آسکتی تھی، جو بیسویں صدی کے سنجیدہ اسلوب نگارش رکھنے والے انشاء پردازوں کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن مولانا نے ہمیشہ تحریر کو وسیلۂ اصلاح وتربیت کے طور پر استعمال کیا۔ عربی تحریر ہو یا اردو، جب ضرورت سمجھی تب ہی قلم اٹھایا۔ بغیر کسی خاص مقصد کے لکھتے رہنے کو نہ اپنے لیے روا رکھا اور نہ اپنے وابستگان کو اس کی اجازت دی۔

(۴) انفرادی ملاقاتیں

داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نے اپنی مجلسوں اور انفرادی ملاقاتوں کو خالص اصلاح وتربیت کے لیے اختیار کیا تھا۔ انھیں مجلس لگانے سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔

---

(۱) پندرہ روزہ تعمیر حیات، مفکر اسلام نمبر، ص: ۲۸

یہی وجہ تھی کہ جب وہ دورانِ مجلس کسی بڑے کو دیکھ لیتے تو اگر ممکن ہوتا تو اسے اپنی جگہ بٹھا کر خود استفادے کی غرض سے اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے اور اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو خود اپنے اہلِ مجلس سمیت اس بڑے سے استفادے کے لیے چلے جاتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں شروع ہی سے بڑی کشش رکھی تھی۔ لوگ ان سے ملتے، متاثر ہوتے اور بار بار ملنا چاہتے۔ ملنے کے لیے وقت مانگتے تو مولانا عام طور پر عصر بعد کا وقت دیتے تھے۔ جب کئی لوگ عصر بعد جمع ہو جاتے تو خود بہ خود مجلس جم جاتی اور جب مجلس جم جاتی تو مولانا اس موقعے کو غنیمت جانتے ہوئے یا تو خود کوئی گفتگو کرنے لگتے یا کوئی اہم کتاب پڑھ کر سنواتے۔ چناں چہ ہوتے ہوتے عصر بعد کا وقت باقاعدہ مجلس کا وقت بن گیا تھا۔ علماء، ذمے دارانِ مدارس، طلبہ اور دوسرے افراد اسی وقت جمع ہوتے۔ مولانا بہ ذاتِ خود اندر تشریف لے جاتے اور جب باہر آتے تو تمام اہلِ مجلس مولانا کے انداز پر شرمندہ سے ہوتے، کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ میں چائے کی ٹرے لے کر آتے تھے۔ جب چائے تقسیم ہونے لگتی تو جس کو جو کپ ملتا اسے وہ کپ اپنے ہی پاس رکھنے کی تاکید ہوتی تھی۔ اگر وہ آگے بڑھا دیتا تو مولانا کو سخت ناگوار ہوتا۔ فرماتے تھے ''آپ مہمان ہیں۔ چائے کی خواہش ہو تو لیں، ورنہ منع کر دیں۔ میزبان کی چیز کو کسی دوسرے کو دینے کا حق آپ کو نہیں ہے۔'' اس لیے جو لوگ مولانا کی مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے وہ ایسا نہیں کرتے تھے اور جو پہلی بار آتے تھے وہ اگر ایسا کرتے تھے تو اہلِ مجلس خاموشی سے خود ہی اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ عصر بعد کی مجلس کے علاوہ مولانا ندوے میں بھی حسبِ ضرورت ملنے والوں کو بلا لیا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ ندوے میں ہوں یا اپنی رہائش گاہ ''خاتون منزل'' میں، اپنے گھر کی قریبی مسجد ''مسجد ماموں بھانجہ'' میں ہوں یا شہر کے کسی اور مقام پر، وہ جہاں ہوتے ملاقات کی خواہش رکھنے والوں کو حسبِ موقع وہیں بلا لیتے تھے۔

کسی شخص کو اگر مولانا سے رازداری میں گفتگو کرنی ہوتی تو اس کے لیے بھی تنہائی کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ کوئی اپنے گھریلو مسائل بیان کرتا، کوئی خاموشی سے میدان

دعوت کے تجربات سناتا اور مشورے لیتا، کوئی خواب کی تعبیر معلوم کرنے آتا، کوئی فقہی مسائل پوچھنے آتا، کوئی اپنے تعلیمی و تربیتی مسئلے لے کر آتا اور کوئی دو لوگوں یا دو گروپوں کا آپسی جھگڑا سلجھانے کے لیے دونوں فریقوں کو لے کر آجاتا۔ مولانا سب کے لیے حاضر رہتے اور الگ الگ اوقات میں سب کے مسائل سنتے اور ان کو حل کرتے۔

غرض یہ کہ مولانا نے انفرادی ملاقاتوں کو خالص اصلاحی و تربیتی رنگ دے رکھا تھا۔ ان کے ہاں یہ مجلسیں اور ملاقاتیں اپنی مسند کو بلند کرنے یا اظہار مشیخت کے لیے نہیں ہوتی تھیں، بل کہ انسانوں کی خدمت کر کے رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے ہوتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اصلاح و تربیت کے جو طریقے اختیار کیے تھے، وہ سب کے سب نہایت مفید اور کارگر ثابت ہوئے۔ بیعت و ارشاد، تقریر، تحریر اور مجلسیں و ملاقاتیں، سب کو انھوں نے بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر میں مولانا کے تربیت یافتہ افراد پھیل گئے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے وہ کام کرنے لگے جو انھیں مولانا نے تفویض کیے تھے۔ ایک پورا دعوتی و اصلاحی نظام وجود میں آ گیا، جس کا مرکز و محور مولانا کی ذات گرامی تھی اور یہ پورا نظام مذکور بالا طریقوں کے ذریعے ہی قائم ہوا تھا۔

دعوت

موجودہ دور میں غیر مسلموں میں دعوت کا کام انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ خاص طور پر ہندستان میں تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں بچا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو پیغام الٰہی سے آشنا کرائیں اور انھیں بتائیں کہ مسلمان ہی اہل ملک کی نجات کا ذریعہ ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دعوت کی یہ تحریک جس سرگرمی کے ساتھ چلنی چاہیے تھی اس سے کم اور بہت کم انداز میں چلی۔ البتہ گزشتہ برسوں میں اس سلسلے میں کچھ بے داری دیکھنے میں آئی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں الگ الگ انداز سے دعوتی کام شروع ہوئے اور الحمدللہ اب ان کاموں کے مثبت نتائج بھی سامنے آنے لگے ہیں۔ لیکن ان تمام کام کرنے والوں کے اصول وطریقہ کار کو بہ غور دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ ان میں سے اکثر قرآن کے اصول دعوت پر صد فی صد عمل کرنے کے بہ جائے اپنے اپنے نظریات پر عمل کر رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دعوت کا کام کرنے والے یہ افراد اور ادارے غیر مخلص ہیں۔ حاشا وکلا، ہم کسی کی نیت پر شک کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ البتہ جو چیزیں صاف نظر آ رہی ہیں ان پر خاموش رہنا بھی نامناسب ہے۔

قرآن وحدیث میں دعوت کے انتہائی جامع اور مفید اصول بیان کیے گئے ہیں۔ یہ اصول ہر زمانے، ہر قوم اور ہر ملک سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے لیے کارگر ہیں۔ ان میں مقصد دعوت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور داعی و مدعو کے مزاج اور نفسیات کو بھی۔

لہٰذا دعوت کا ہر کام مکمل طور سے ان ہی اصولوں کی روشنی میں ہونا چاہیے۔لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندستان میں اکثر دعوتی کام کرنے والوں میں ان اصولوں کی مکمل پیروی نظر نہیں آتی۔مکمل پیروی نظر نہ آنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ خدانہ خواستہ ان اصولوں سے مکمل انحراف ہے۔نہیں، ہرگز نہیں۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ کوئی کچھ اصولوں کو پکڑے ہوئے ہے اور کوئی دوسرے کچھ اصولوں کو۔کوئی ''موعظت حسنہ'' پر سارا زور صرف کررہا ہے اور باقی چیزوں کو چھوڑے ہوئے ہے اور کوئی ''جدال احسن'' کو ہی دعوت کا طریقہ کار سمجھ رہا ہے۔کوئی ''حکمت'' کا مطلب قرآن اور وید وغیرہ میں بے تکی مماثلتوں کو سمجھے بیٹھا ہے اور کوئی صرف کلمہ پڑھا دینے کو کافی سمجھ رہا ہے۔دعوتی کام میں اس نقص کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر دعوتی کاموں کے روح رواں قرآن وحدیث، سیرت وتاریخ اور مقاصد شریعت واسرار دین کا گہرا علم نہیں رکھتے۔جس کے نتیجے میں ایسے بہت سے نقائص پیدا ہوگئے ہیں، جن کا دور کیا جانا اس مبارک کام میں لگنے والوں کے لیے ضروری ہے۔تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ورنہ ملک بھر میں چلنے والے تمام دعوتی کاموں کا الگ الگ جائزہ لے کر ان کے محاسن ومعائب کو اجاگر کرنا بہت مفید ہوسکتا ہے۔یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا کام ان نقائص سے پاک تھا، جو دوسرے بہت سے داعیوں کے کاموں میں پائے جاتے ہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا ایک مستند عالم دین تھے۔ایک جلیل القدر شخصیت کے خلیفہ اور دوسرے بہت سے بزرگوں کے معتمد علیہ تھے۔تقریباً ۳۵ سال سے ندوۃ العلماء جیسی عالمی دانش گاہ میں تفسیر و حدیث، عربی زبان وادب اور اسرار شریعت کے استاد تھے۔دین اور احکام دین ان پر پوری طرح واضح تھے۔شریعت مطہرہ کی حکمتوں کو وہ بہ خوبی سمجھے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ ایک عربی جریدے سے مسلسل وابستگی کی وجہ سے دنیا کے حالات پر ان کی نظر تھی۔ایک کامیاب خطیب کی حیثیت سے وہ ملک کے گوشے گوشے میں گھومے ہوئے تھے۔ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ میدانِ دعوت میں اترے تو پوری مضبوطی کے ساتھ اترے۔وہ اپنے

آباء واجداد میں حضرت شاہ علم اللہ حسنی سے لے کر مولانا سید محمد رابع حسنی تک تمام بزرگوں کو دیکھ چکے تھے کہ سب کے سب اپنے کاموں اور کارناموں کو کس طرح چھپاتے ہیں اور صرف رضائے الٰہی کے لیے اپنی ہر حصول یابی کو اس کے دربار میں پیش کر کے بھول جاتے ہیں۔ مولانا نے بھی یہی کیا۔ ایک طرف دین کے گہرے علم نے ان کو مضبوط افراد فراہم کیے تو دوسری طرف حالات اور مواقع کا خیال رکھنے کی وجہ سے ان کے کام کو پھیلنے کا بھرپور موقع ملا۔ پھر جو بھی کامیابی ہوئی اس کو مکمل اخفاء میں رکھنے سے ان کے کاموں میں بے انتہا برکت ہوئی اور وہ حیرت انگیز طور پر مرجعیت حاصل کرتے چلے گئے۔

دعوتی کام کا آغاز

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر غیر مسلموں میں دعوتی کام کا جذبہ عطا فرمایا تھا۔ اس کے لیے مولانا نے نہ کسی سے تربیت لی اور نہ کوئی کورس کیا۔ اپنے طور پر کام شروع کیا اور اُسے بڑھاتے چلے گئے۔ انھوں نے دعوتی کام کا خواب بھی خود دیکھا اور اس کو تعبیر بھی خود ہی کیا۔ اس کام کا میدان بھی خود منتخب کیا اور اس کو ہموار بھی خود ہی کیا۔ اس کو وسعت دینے کے نئے نئے طریقے اختیار کیے، نئے نئے منصوبے بنائے اور ان تمام منصوبوں میں رنگ بھر کر ایک پورا دعوتی نیٹ ورک کھڑا کر دیا۔ ان کا اخلاص اور ان کے بڑوں کی دعائیں ہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں بہت کم وقت میں اتنی برکت اور اتنی وسعت عطا فرمائی، جس کی امید شاید خود انھیں بھی نہ رہی ہوگی۔ اپنے کام کے آغاز کے متعلق انھوں نے بتایا تھا:

> ''ابتداء میں تو میں انفرادی طور پر غیر مسلموں کے سامنے اسلام کا تعارف پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی درمیان ''اسلام کا مختصر تعارف'' مرتب شدہ حضرت مولانا (علی میاں ندوی) کو دکھائی تو انھوں نے بھی بہت دعائیں دیں اور ہمت افزائی کی۔ اس کتاب سے بھی دعوت میں بہت مدد ملی۔ کچھ روابط بڑھے تو جلسوں وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا اور کچھ کام پھیلا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ

اپنی توفیق خاص سے نومسلموں کی ایک ٹیم تیار کردی تو بڑا سہارا ہوا اور کام خوب پھیلنے لگا۔ ایسے نتائج سامنے آنے لگے کہ میں حیران رہ جاتا ہوں۔ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور بڑوں کی دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے۔ اب حضرت مولانا کی بہت یاد آتی ہے کہ وہ ہوتے تو ان نومسلموں کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔ سب کو کتنی دعائیں دیتے۔ دل چاہتا ہے کہ امت دعوت کے اس کام کو سمجھے۔ بالخصوص علماء اس کی طرف آئیں۔ یہی کام تو کرنے کا ہے۔ سب نے دعوت کی من مانی تشریحات کر رکھی ہیں، اصل دعوت کی طرف کوئی آتا ہی نہیں ہے۔"

اصول دعوت

ہم مولانا کے دعوتی کام کو چند نکات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) توحید خالص اور ترک شرک
(۲) مدعو کا اطمینانِ قلب
(۳) ویدوں سے محتاط استفادہ
(۴) نومسلموں کی تربیت
(۵) اخفاء

(۱) توحید خالص اور ترک شرک

داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا ماننا تھا کہ دعوت دین کا کام خالص قرآن وسنت کی روشنی میں انجام دیا جانا چاہیے۔ اگر ہم مختلف خدشات اور وسوسوں کا شکار ہو کر ان اصولوں سے ذرا بھی ہٹیں گے تو وہ نتائج برآمد نہیں ہو پائیں گے، جو قرآن چاہتا ہے۔ اس لیے مولانا توحید خالص کی صاف صاف دعوت اور اس کے ساتھ بت پرستی اور شرک کی برائیاں اور مفاسد بیان کرنے کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ اگر شرک کی برائی دلوں میں راسخ نہ کی گئی تو اس بات کا پورا پورا اندیشہ رہتا ہے کہ وہ شخص بہ ظاہر مسلمان تو ہو جائے گا لیکن اس کے اندر شرک کے جراثیم موجود رہیں گے، جو کسی موقعے پر ظاہر ہو سکتے ہیں۔

اس کے برخلاف دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے داعی اس معاملے میں مداہنت سے کام لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر شرک و بت پرستی کی برائی کی گئی تو مدعو اسلام سے متنفر ہو جائے گا اور کلمہ نہیں پڑھے گا۔ حالاں کہ یہ سوچ قرآن کریم اور رسولِ کریم ﷺ کے اصول دعوت کے بالکل برخلاف ہے۔ ہمیں یہ ذمے داری دی گئی ہے کہ ہم اللہ کا پیغام دوسروں تک پہنچائیں۔ چاہے کوئی ایمان لائے نہ لائے۔ ہم کلمہ پڑھانے کے ذمے دار نہیں ہیں۔ یہ مدعو کی توفیق اور فطرت پر منحصر ہے کہ وہ اسلام قبول کرتا ہے یا نہیں۔ وہ اسلام قبول کرے یا نہ کرے، داعی تو کامیاب ہو گیا۔ گویا داعی کے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں یا یوں کہہ لیں کہ چت بھی اس کی ہے اور پٹ بھی۔ داعیوں میں یہ غلط سوچ اور اسلام کا مکمل پیغام پہنچانے کے بہ جائے اس کی زبان سے کسی بھی طرح کلمۂ طیبہ ادا کرا دینے کو اصل سمجھنا، قرآن و حدیث کے اصولِ دعوت پر گہری نظر نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ جس سے داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کوسوں دور تھے۔

(۲) مدعو کا اطمینان قلب

مولانا عبداللہ حسنی اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ داعی، مدعو کے دل کو مطمئن کرنے پر اصل محنت کرے۔ دعوت کے قرآنی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے اس بات کی پوری کوشش کرے کہ مدعو دل سے اسلام کی حقانیت کا قائل ہو جائے۔ شرک و بت پرستی کو کھلی گم راہی سمجھنے لگے اور توحید کو روح کے اطمینان کا ذریعہ۔ وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ دعوت دیتے وقت غیر متعلق باتیں کی جائیں یا کوئی عارضی لالچ دے کر توحید و رسالت کی سرسری سی تعریف کر دی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلی مرتبہ مدعو کو اسلام کے انسانی بھائی چارے کا تصور بتایا جائے۔ اسی لیے وہ تحریک پیام انسانیت کو غیر مسلموں سے ملاقات کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔ پہلی ملاقات میں اسے اسلام کے متعلق گفتگو کرنے پر آمادہ کر لینے کے بعد وہ چاہتے تھے کہ مدعو سے اس کی ذہنی و علمی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے بار بار ملاقاتیں کی جائیں۔ اسے مختلف کتابوں کا مطالعہ کرایا جائے۔ اسلام کے متعلق جو

اعتراضات اس کے ذہن میں ہوں ان پر کھلی گفتگو کی جائے اور جب وہ کئی ملاقاتوں کے بعد قبول اسلام کا ارادہ ظاہر کرے تو بھی اس سے پوچھ لیا جائے کہ کیا وہ پوری طرح مطمئن ہو چکا ہے؟ کیا اس کے ذہن میں اب اسلام کے متعلق کوئی اعتراض نہیں ہے؟ اور کیا وہ اسلام کو سب سے بہتر مذہب سمجھنے لگا ہے؟ اگر وہ اثبات میں جواب دے تو اسے کلمہ پڑھایا جائے۔ ورنہ مزید تحقیق و جستجو اور بحث و گفتگو کی ترغیب دی جائے۔

مولانا اس بات کا بھی اظہار کیا کرتے تھے کہ معمولی علم والے غیروں کو اسلام پر مطمئن نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے جہاں حکمت و مصلحت کا ادراک ہونا ضروری ہے، وہیں اچھے اور دل کش اسلوب میں اسلام کے متعلق اہم حقائق پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

(۳) ویدوں سے محتاط استفادہ

ہندستان میں ویدک ستیہ سناتن دھرم کے ماننے والوں کا دعویٰ ہے کہ وید آسمانی کتاب ہیں۔ ویدوں میں موجود توحید کی تعلیمات ان کے اس دعوے کی تصدیق کے لیے معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بہت سے داعیوں نے ویدوں کو آسمانی کتاب تسلیم کرتے ہوئے قرآن اور وید میں مماثلتیں تلاش کرنی شروع کیں۔ جن میں سے کچھ بالکل درست معلوم ہوتی ہیں اور کچھ دور دراز کی تاویلوں سے وجود میں آئی ہیں۔ مولانا عبداللہ حسنی نے اس مسئلے میں بھی عالمانہ اور معتدل راہ اپنائی تھی۔ وہ ویدوں کے ان واضح بیانات کو دعوتی گفتگو کے درمیان پیش کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے، جو وحدانیت کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن دور دراز کی تاویلوں کے بعد پیدا کی جانے والی یکسانیتوں سے احتراز کرتے تھے۔ ساتھ ہی ویدوں کا تحقیقی مطالعہ کر کے ان میں موجود اسلامی تعلیمات کو شائع کرنے کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی سرپرستی میں کئی اہم کام بھی کرائے۔ خاص طور پر ''شیام سندرم آشرم مٹھ'' کے مہاراج وکاسانند برہم چاری (جو بعد میں معظم حسین کے نام سے مشہور ہوئے) نے مولانا کی سرپرستی میں ویدوں کے متعلق اہم علمی کام پیش کیا۔

(۴) نومسلموں کی تربیت

مولانا عبداللہ حسنی ندوی اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ اسلام قبول کرنے والوں کو عقائد و احکام کی مضبوط تربیت بھی دی جانی چاہیے۔ یعنی اصولی باتوں پر اپنے دل کو مطمئن کر کے جب وہ اسلام قبول کرلیں تو ہمارے پاس کوئی ایسا مضبوط نظام ہونا چاہیے جو ان کے مزاج اور ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے شرعی احکام سکھائے۔ جہاں ان کے لیے اسلامی کتابوں کا بھی نظم ہو اور قرآن وغیرہ سیکھنے کے لیے معلمین کا بھی۔ مولانا اس تربیتی نظام کو ہر صورت میں لازم سمجھتے تھے۔ کیوں کہ نومسلموں کی ذہنیت اور دینی سطح مختلف ہوتی ہے۔ انھیں مسلمانوں کی کسی تنظیم و جماعت سے جوڑ کر دینی تربیت دینا خلاف عقل بھی ہے اور خلاف مصلحت بھی۔ جو شخص پیدائشی مسلمان ہو، وہ چاہے کتنا ہی جاہل اور کم پڑھا لکھا کیوں نہ ہو، اپنی دینی سوچ اور ایمانی سطح کے لحاظ سے کسی نومسلم سے یقیناً مختلف ہوگا۔ اس لیے نومسلموں کی تربیت کا کوئی مستقل نظام قائم کرنا لازمی ہے۔ مولانا ایسے اداروں کے قیام کو لازمی سمجھتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے مضبوط اقدامات بھی کیے۔

(۵) اخفاء

مولانا عبداللہ حسنی ندوی دعوتی کام کرنے والوں کے لیے اخفاء کو فرض عین کے درجے میں رکھتے تھے۔ اخفاء کا مطلب پراسراری یا غیر قانونی قسم کی خفیگی نہیں، بل کہ اس بات کی حتی الامکان کوشش ہے کہ اپنے کام اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو بلاوجہ دوسروں کے سامنے بیان نہ کیا جائے۔ وہ اس اصول پر خود بھی سختی سے عامل تھے۔ شاید ہی کسی نے ان کی تقریروں یا تحریروں میں اپنے کام کا تذکرہ سنا ہو۔ ہاں کسی شخص کو دعوت کے لیے مفید سمجھتے تو تنہائی میں یا چند خاص لوگوں کے سامنے اپنے کام کے شان دار نتائج میں سے کچھ بیان کر دیتے تھے۔ لیکن مختلف طریقوں سے اپنے کام کا تعارف کرانا یا ہر تقریر و تحریر میں اپنی فتوحات کے قصیدے پڑھنا، اُن کے مزاج و اصول کے خلاف تھا۔

اس اخفاء کی دو وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ اس میں ریاکاری کا پورا اندیشہ ہوتا ہے اور

نفس امارہ کو اپنی خباثتیں پھیلانے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔اس لیے کہ جب لوگ انسان کی کام یابیوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کا نفس پھولنے لگتا ہے اور وہ خود کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح اصل کام پر توجہ ہونے کے بہ جائے اپنی فتوحات کو بیان کرنے پر محنت صرف ہونے لگتی ہے۔اس کے برخلاف جب خاموشی سے کام کیا جاتا ہے تو یہ تمام خطرات پیدا نہیں ہوتے اور آدمی پہلے جیسی رفتار کے ساتھ کام کرتا چلا جاتا ہے۔دوسری وجہ یہ تھی کہ اپنے کام کی تشہیر کرنے سے بہت سے دوسرے مسائل بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔کیوں کہ ہندستان میں فرقہ پرستوں کا ایک ٹولہ ہمیشہ سے امن وامان کے خلاف رہا ہے۔وہ امن کا دشمن اور فساد کا دوست ہے۔ہمارے کاموں سے ناراض ہوکر وہ مختلف رکاوٹیں کھڑی کرسکتا ہے۔اگرچہ دعوت کے کام میں کوئی غیر قانونی چیز نہیں،لیکن بلاوجہ کسی کو رکاوٹ ڈالنے کا موقع کیوں دیا جائے؟ان دونوں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا دعوتی کاموں کے اخفاء پر بے حد زور دیتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ جو بھی کیا جائے قرآنی اصولوں کی روشنی میں کیا جائے۔نبوی طریقے پر کیا جائے۔رضائے امت کے لیے نہیں،رضائے الٰہی کے لیے کیا جائے۔شور شرابے اور پروپیگنڈے کے بغیر کیا جائے۔

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی (جنرل سکریٹری مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی، بھٹکل،کرناٹک) نے مکمل اخفاء سے کام لینے اور اپنے کاموں کا اشتہار نہ کرنے کو مولانا کے کام کی وسعت کی اصل وجہ قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں ان کی رائے اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ وہ خود بھی دعوت کے کاموں کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں اور منظم انداز میں ہر سال کئی ہزار غیر مسلم طلبہ وطالبات کو اسلام کا تعارف کراتے ہیں۔انھوں نے لکھا ہے:

> ''مولانا کے دعوتی کاموں میں برکت کی سب سے اولین بڑی وجہ جو شاید اللہ کو پسند آئی وہ اپنے کاموں کی عدم تشہیر تھی۔ان کے دعوتی کاموں کی وسعت کا اندازہ آپ صرف اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ گزشتہ سفر لکھنؤ میں مجھے معلوم ہوا کہ کام کی وسعت کا یہ عالم ہوگیا ہے کہ الحمدللہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ مولانا کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی اپنے بندے کی ہدایت کا ذریعہ نہ بناتا ہو۔مجھے بھی مولانا

دعوتی کاموں کے خوش کن نتائج کے اخفاء کا حکم دیتے، حتی کہ اکیڈمی کے جو سیرت کے مقابلے مولانا کی نگرانی میں کئی جگہوں پر ہوئے اور اس کے جو مسرت آمیز نتائج اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمائے، اس کی بھی اطلاع خود مجھے دینے سے بعض اوقات وہ گریز کرتے۔ ۲۰۱۱م میں مولانا نے ایک شہر میں برادران وطن میں اکیڈمی کا سیرت مقابلہ کروایا اور اس میں الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے توقع وامید سے زیادہ خوش کن نتائج ظاہر فرمائے، جو حیرت انگیز بھی تھے اور مسرت آمیز بھی۔ اس کی بھی اطلاع مولانا نے کئی مہینوں بعد وہ بھی ایک نجی مجلس میں دی۔ دعوتی کام میں اسی اخفاء وعدم تشہیر کی ہدایت مجھے مخدومی حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم نے دے رکھی تھی۔ اس لیے ہم نے اکیڈمی کے خبرنامے اور ویب سائٹ وغیرہ بند کردیے اور اپنا تعارف نامہ شائع کرنے سے بھی گریز کیا۔ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب نے فرمایا کہ اس تشہیر سے ۳ نقصانات ہوں گے: (۱) کام پر اثر پڑے گا۔ قانونی اعتبار سے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔ (۲) اپنی کارگزاری کو سن کر نفس پھول جائے گا۔ (۳) لوگوں میں حاسدین پیدا ہوں گے۔

ان دونوں اللہ والوں کی اس ہدایت کا ہمیشہ مجھے فائدہ نظر آیا۔"(۱)

دعوتی طریقۂ کار

مذکورہ بالا پانچ نکات کو ہم مولانا کے دعوتی اصول کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ یعنی مولانا دعوت دینے والوں کے لیے ان پانچ چیزوں کے اہتمام کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی چیزیں ہوسکتی ہیں لیکن وہ فروعی نوعیت کی ہوں گی، اصولی حیثیت ان پانچوں ہی کو حاصل ہے۔ ان پانچوں اصولوں پر چلتے ہوئے مولانا نے جب کام کرنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت دی اور یہ کام آہستہ آہستہ پورے ملک میں پھیل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے وہ دن بھی دکھایا کہ ان کے پاس غیر مسلم حضرات وفدوں اور جماعتوں کی

(۱) ماہنامہ پیام عرفات، خصوصی شمارہ بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی ص: ۱۱۲-۱۱۳

شکل میں آنے لگے اور ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے لگے۔ مولانا دعوت پیش کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتے تھے۔ ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

(۱) پیام انسانیت
(۲) انفرادی ملاقاتیں
(۳) لٹریچر کی تیاری
(۴) لٹریچر کی نمائش
(۵) کیمپوں کا انعقاد
(۶) طلبہ کے لیے مقابلے
(۷) دعوتی سینٹر کا قیام

(۱) پیام انسانیت

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی تحریک پیام انسانیت کو دعوتی نقطۂ نظر سے بہت مفید سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا تھا:

> "جب کسی سے گفتگو کی جاتی ہے تو اصول یہ ہے کہ پہلے سلام کیا جائے اور اس کے بعد کلام۔ لوگ پیام انسانیت کو سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ ایک دعوتی سلام ہے جس سے دعوتی کلام کا راستہ کھلتا ہے۔"

اس لیے مولانا نے نہایت سرگرمی کے ساتھ ملک کے کونے کونے میں پیام انسانیت کے اجلاس منعقد کرائے۔ جن میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے، انسانیت کی باتیں سنتے، اسلام کے متعلق اپنا ذہن صاف کرتے اور ساتھ ہی اسلام کے بنیادی اصول بھی سن کر لوٹتے۔ اس پورے سلسلے سے سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا تھا کہ ان کا دل اسلام کو سمجھنے کے لیے آمادہ ہو جاتا تھا۔ مولانا نے اپنے ایک مضمون میں دعوتی کام کرنے والوں کے لیے جو اصول بتائے ہیں ان کا آغاز ان دو اصولوں سے ہوتا ہے کہ ہمیشہ تحریک پیام انسانیت کا لٹریچر اپنے پاس رکھیں، سفر حضر میں لوگوں کو وہ لٹریچر پہنچاتے رہیں اور اس لٹریچر کو اپنی

مقامی زبانوں میں شائع کرا کے تقسیم کرائیں۔ ساتھ ہی پیام انسانیت کے دورے کرنے والے افراد کا ہر طرح سے تعاون کریں اور خاص طور پر یہ کہ غیر مسلموں سے رابطہ کر کے پیام انسانیت کے آنے والے کارکنان سے ملاقاتیں کرائیں۔ غرض یہ کہ مولانا تحریک پیام انسانیت کو داعیوں کے لیے انتہائی مفید بھی سمجھتے تھے اور ان کی دعوت کے لیے سب سے بڑا معاون بھی۔ نہ جانے مولانا نے ملک بھر میں پیام انسانیت کے کتنے جلسے اور کانفرنسیں منعقد کیں۔ ہر جگہ اپنی ٹیم کے ساتھ خود بھی حاضر ہوتے اور ان جلسوں کو خالص جلسہ بنانے کے بہ جائے ایک دعوتی ورک شاپ کی شکل دے دیتے تھے۔ لٹریچر تقسیم کرواتے، لٹریچر کی نمائش لگواتے، کچھ اہم لوگوں سے انفرادی ملاقاتیں کرتے، جس شہر میں جاتے اس شہر کے مختلف علاقوں میں اپنے رفقاء کو بھیجتے، لوگوں کے نام پتے لے کر ان کی طلب پر لٹریچر بھیجنے کا انتظام کرتے اور ہمیشہ کے لیے اس جگہ پیام انسانیت کا مستقل نظم قائم کر کے لوٹتے۔

مولانا پیام انسانیت کے اس کام میں اتنے منہمک اور اس کام سے اتنے پر امید تھے کہ انھیں اپنی صحت کی بھی کوئی پرواہ نہیں رہ گئی تھی۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ مولانا کی وہ بیماری جس نے انھیں اس دنیا سے لے جا کر ہی چھوڑا، وہ بیماری بھی پیام انسانیت کے ایک طویل سفر میں کھل کر سامنے آئی تھی۔ یعنی پیام انسانیت ہی کے راستے میں ان کے مرض وفات کا آغاز ہوا۔ یہ سفر ہندستان کے اہم صوبے مہاراشٹر کا تھا، جو ۳/مارچ ۲۰۱۳م سے ۱۳/مارچ ۲۰۱۲م تک جاری رہا۔ مہاراشٹر کے دس مقامات پر رکتے ہوئے اور ساڑھے چار ہزار کلو میٹر کی مسافت طے کرتے ہوئے مولانا نے ۲۲/اجتماعات میں شرکت کی اور ہزار ہا ہزار افراد کو انسانیت کا پیغام دیا۔ اس دوران ہونے والے کچھ جلسوں میں دس دس ہزار افراد شریک ہوئے۔ یہ پیام انسانیت سے مولانا کے حد درجہ تعلق کا نتیجہ تھا۔

(۴) انفرادی ملاقاتیں

مولانا صرف اسٹیج پر تقریریں کرنے یا دوسروں کے ذریعے کام کرا کر خود کلمہ پڑھا

دینے کو کسی طرح درست نہیں سمجھتے تھے۔ بڑے بڑے اجتماعات کے ساتھ انھوں نے ہمیشہ انفرادی ملاقاتوں کو ضروری سمجھا۔ یہ ملاقاتیں جہاں مناسب ہوتا کر لیتے تھے۔ اپنے گھر پر بھی بلالیا کرتے تھے، ندوے میں الرائد کے دفتر میں بھی اور دوسرے مقامات پر بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ خود جا کر ملاقات کرنے کا بھی معمول تھا۔ رفقاء کے مشورے سے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں طے ہوتیں اور مولانا خود تشریف لے جا کر بھی اسلام کی دعوت پیش کرتے تھے۔

(۳) لٹریچر کی تیاری

مولانا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ تعلیم کے اس دور میں اسلام کو عصری اسلوب میں پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے انھوں نے لٹریچر تیار کرایا اور جتنا تیار ہوا اس سے زیادہ کی اشاعت کا پروگرام ان کے ذہن ودماغ میں تھا، جس کو وہ اہل تعلق کے سامنے بیان کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کو عملی جامہ بھی پہنا رہے تھے۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت بالغہ کو یہ منظور نہ تھا۔

اس سلسلے میں جو چند اہم کام مولانا نے کرائے ان میں سب سے پہلے "اسلام کا تعارف" نامی کتاب ہے، جو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتابوں سے جمع کیے گئے مضامین واقتباسات کا مجموعہ ہے، لیکن مستقل کتاب معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب انگریزی اور ہندی میں بھی شائع ہوئی۔ ہر زبان کے کئی کئی ایڈیشن نکلے، ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کی گئی اور تعارف اسلام کا ایک اہم ذریعہ بنی۔ اسی طرح مولانا ابوالحسن ندوی کی کتاب قصص النبیین کا ہندی ترجمہ کرایا اور لاکھوں کی تعداد میں ملک بھر میں پھیلا دیا۔ ہندی کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں میں بھی یہ کتاب شائع ہوئی۔ معظم حسین صاحب سے ویدوں پر تحقیقی کام کرایا۔ جناب انجم فراز سے بدھ مت پر خالص علمی انداز کا کام کرایا۔ غرض یہ کہ انھوں نے دعوت کے میدان میں تحقیقی لٹریچر کے ساتھ ساتھ عام فہم لٹریچر کی تیاری کا ایک منصوبہ بنا رکھا تھا۔ جن میں سے کچھ سامنے آیا اور کچھ نہ آ سکا۔ اس کام کو مزید تقویت دینے کے لیے

مولانا نے ''ستیہ مارگ پرکاشن'' کے نام سے ایک مستقل اشاعتی ادارہ بھی قائم کردیا تھا، جس سے بہت مفید دعوتی لٹریچر شائع ہوا۔

استاد عالی مقام مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے لٹریچر کی اہمیت اور اس میدان میں مولانا عبداللہ حسنی کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پہلا میدان جو انھوں نے اپنے دادا کی خواہش اور پسند کا اختیار کیا، وہ غیر مسلموں میں اسلام کا تعارف ہے، جس میں مسلمانوں سے پوری تاریخ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ خاص طور پر پس ماندہ طبقات، جو علم سے محروم ہیں اور ان کو اختلاط کا موقع بھی نہیں ملتا کہ وہ دوسروں کے اخلاق و کردار کو دیکھ کر یا مطالعے سے اسلام کی تعلیمات سے واقف ہوں۔ اہل علم اور اعلیٰ طبقہ جو لٹریچر پڑھتا ہے، وہ لٹریچر اسلام کے بارے میں اچھا تاثر دینے کے بہ جائے نفرت اور مذمت کا تاثر دیتا ہے۔ اس میں مسلم حکم رانوں کو موضوع بنا کر پوری مسلم قوم یا اسلام کو بدنام کیا جاتا ہے۔ یہ لٹریچر سامراجی عہد میں تیار کیا گیا اور اسی کو سورس (Source) سمجھ کر دوسری زبانوں میں اس کے تاثرات منتقل ہوئے۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس وقت جو ماحول ہے، وہ نتیجہ ہے عدم اختلاط اور غلط علم کا۔ اس لیے جہاں بھی صحیح علم پہنچا یا اسلامی ذہن کے لوگوں سے سابقہ پڑا، وہاں ذہنیت میں تبدیلی آئی۔ کثرت سے اسلام لانے والے اکثر صحیح لٹریچر پڑھنے والے یا صحیح مسلمانوں سے رابطہ رکھنے والے ہیں۔ اکثر ٹرینوں اور جلسوں میں مختلف ملاقاتوں اور تبادلۂ خیال سے ذہنوں کی صفائی کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ مولوی عبداللہ حسنی نے اس حقیقت کو سمجھا اور اس کو میدان عمل بنایا۔ مخلوط اجتماعات کا نظم، ملاقاتوں اور تبادلۂ خیال کے مواقع کا نظم انھوں نے اختیار کیا۔ اس کے اچھے نتائج سامنے آئے۔

پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط تصورات کی تصحیح کی کوشش کی اور اس کے بعد اسلام کے متعلق شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے لٹریچر تیار کرایا اور مخلوط اجتماعات منعقد کیے۔

اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلام سے واقفیت حاصل کرنے والوں اور نومسلموں کے مسائل سے دل چسپی لی اور ان کے ساتھ ہم دردی کا اظہار کیا اور ان کو مطمئن کرنے کی فکر کی۔ اپنی مختصر عملی زندگی میں اس میدان میں ان کو جو کام یابی ملی وہ تعجب خیز ہے۔

انھوں نے اسلام کے تعارف کے لیے لٹریچر تیار کرایا۔ ساتھ ساتھ اس لٹریچر کو عام کرنے کے اقدامات کیے۔ مختلف اجتماعات، نمائشوں اور کانفرنسوں کے موقعے پر اس لٹریچر کو عام کیا۔"(۱)

(۴) لٹریچر کی نمائش

مولانا اپنے رفقاء کے ذریعے پیام انسانیت اور دعوتی لٹریچر کی نمائش کا بھی اہتمام کراتے تھے۔ ان کے رفقاء پیام انسانیت کے نام سے مختلف کتاب میلوں، مذہبی میلوں اور عام نمائشوں میں اپنی کتابیں لے کر پہنچتے اور ان کی نمائش کرتے۔ یہ تجربہ کافی حد تک کام یاب رہے اور تعارف اسلام کا ذریعہ بنے۔

(۵) کیمپوں کا انعقاد

مولانا نے دعوتی کام کرنے والوں کے سامنے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ وہ پس ماندہ علاقوں اور گاؤں دیہاتوں میں مختلف کیمپوں کا انعقاد کریں۔ مثال کے طور پر کوئی طبی کیمپ لگائیں اور لوگوں کو مفت جانچ اور واجبی سی قیمت پر دوائیں فراہم کریں۔ اس سے لوگ اسلام کے قریب آئیں گے اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ صرف نظریہ نہیں تھا بل کہ مولانا نے اسے کام یاب تجربہ بھی بنایا۔ ان کیمپوں کے بڑے اچھے نتائج سامنے آئے۔

(۶) طلبہ کے لیے مقابلے

مولانا نے اسکولوں اور کالجوں میں مختلف انداز کے جلسوں، سمی ناروں اور انعامی مقابلوں کا بھی بڑے پیمانے پر اہتمام کرایا۔ اسلام اور سیرت نبوی کے متعلق جلسے اور

---

(۱) ماہ نامہ پیام عرفات، خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی، ص: ۱۶، ۱۷

مضمون نگاری کے مقابلے منعقد ہوئے، جن میں کئی کئی ہزار غیر مسلم طلبہ نے شرکت کی۔ نوجوانوں میں اس کام سے بہت فائدہ ہوا اور بعد میں بہت سے نوجوانوں اور طلبہ نے اسلام بھی قبول کیا۔

(۷) دعوتی سینٹر کا قیام

دسمبر ۲۰۱۰م میں مولانا نے ندوۃ العلماء سے قریب ''العافیہ سینٹر'' کی بنیاد رکھی، جس میں دعوت کا ذوق رکھنے والوں کے لیے دعوتی تربیت کا بھی اہتمام کیا گیا اور نومسلموں کی تعلیم و تربیت کا بھی۔ ہر مہینے دس دن کا دعوتی تربیتی کورس شروع کیا گیا۔ تقریباً پچاس شرکاء ہر ماہ تربیت لینے لگے۔ اسی مرکز میں نومسلموں کی دینی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا، جہاں انھیں قرآن پڑھانے کے لیے قراء اور دینی احکام سکھانے کے لیے علماء کا نظم کیا گیا۔ ستیہ مارگ پرکاشن نامی اشاعتی ادارہ بھی اسی سینٹر کی ایک شاخ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نے دعوت کے قرآنی اصولوں کو بھی مضبوطی سے تھامے رکھا اور زمانے کے تقاضوں کا بھی حتی الامکان خیال رکھا۔ ان دونوں چیزوں کا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے غیر مسلموں میں دعوتی کام کا ایک پورا نظام قائم کر دیا اور خود اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا کی زندگی کا یہ ایسا تاب ناک پہلو ہے جو انھیں تقریباً سوا صدی پر محیط ابنائے ندوہ کی مختلف النوع خدمات میں بالکل ممتاز و منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل؟

داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی حیات اور خدمات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد زندگی کا اکثر حصہ خدمت دین ہی میں گزارا۔ صرف اعلاء کلمۃ اللہ کی فکر کی اور اس کے لیے نئی نئی تدابیر اختیار کیں۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں نوازا اور خوب نوازا۔ انھوں نے اپنے آباء واجداد یا اپنے مرشد ومربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا نہ تو نام استعمال کیا اور نہ پوری زندگی ان حضرات کی قصیدہ خوانی میں صرف کی۔ انھوں نے امت کے حالات پر خود غور کیا۔ بالخصوص ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ پھر ان مسائل کا مناسب حل تلاش کر کے اس حل تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ دن رات ایک کر دی۔ صبح وشام کی تفریق ختم کر دی۔ خود کو کھانے پینے اور اوڑھنے پہننے کی بے جا پابندیوں سے آزاد کر لیا۔ سادہ کھایا، سادہ پہنا اور ساری صلاحیتوں کو فراوانی کے ساتھ دین کے لیے خرچ کیا۔ ان کا اپنا متعین کردہ ایک مقصد زندگی اور ایک نشانہ (Target) تھا، جس تک پہنچنے کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ لگا دیا۔ یہ وہ بھی جانتے تھے کہ انھوں نے اپنے لیے جس منزل کا انتخاب کیا تھا وہاں تک پہنچنا چند برسوں میں ناممکن تھا۔ یوں توفیق الٰہی سے کچھ بعید بھی نہیں۔ وہ چند برسوں میں کیا، چند لمحوں میں دنیا کے کروڑوں انسانوں کے اندر ایمان پیدا فرما دے۔ لیکن دنیاوی اور فطری قانون کے مطابق

ایسا ہونا ناممکن تھا۔اس کے باوجود مولانا چاہتے تھے کہ ہندستان کے ایک ایک غیر مسلم تک اسلام کا پیغام پہنچادیں اور دوسری طرف ہر مسلمان کو صحیح اور مکمل اسلامی فکر میں ڈھال دیں۔ان دونوں عظیم مقاصد کے لیے انھوں نے سخت جدوجہد کی۔ایسی جدوجہد جس نے ان کو اپنی جسمانی فکر اور بیماری کی طرف توجہ دینے کی بھی مہلت نہ دی۔مرض وفات میں بھی وہ لوگوں کی ذہن سازی کرتے رہے اور دعوتی سرگرمیوں کے متعلق پوچھتے رہے۔ اسی فکر اور تگ ودو میں انھوں نے اپنے رب کے حضور حاضری دی۔

مولانا نے اللہ کے رسول ﷺ کے سچے امتی ہونے کا ثبوت اس طرح بھی پیش کیا کہ اپنا کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، بولنا چالنا، اٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا سب کچھ امت کی فکر میں لگادیا اور اس طرح لگایا کہ اپنی فکر نہ رہی۔گویا فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم ان لم یومنوا بھٰذا الحدیث أسفاً. (شاید کہ آپ خودکو غم کی وجہ سے ان کے پیچھے ختم کردیں گے اگر وہ اس کلام پر ایمان نہ لائے) کا حقیقی نقشہ سامنے آ گیا۔مولانا کے وابستگان بھی کہتے ہیں اور ان کی زندگی میں ہر شخص اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے کام کی رفتار اور کام کے لیے ان کی بے چینی و بے قراری دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے انھیں معلوم ہو کہ اس دنیا میں زیادہ نہیں رہنا ہے اور وہ جلدی جلدی اپنا کام نمٹا کر اپنی منزل کے لیے روانہ ہونا چاہتے ہوں۔استاد عالی قدر مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے بھی لکھا ہے:

> ”ان کی بے چینی فکر وعمل کو دیکھ کر بعض وقت محسوس ہوتا تھا کہ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ مدت عمل کم ہے۔وہ چلے گئے لیکن اپنے مشن کو چلانے اور جاری رکھنے کے لیے ایسے افراد چھوڑ گئے جو ان شاء اللہ ان کے نہج پر کام کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔“(۱)

گویا وہ حفیظ جالندھری کے الفاظ میں کہہ رہے ہوں:

ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل؟
مسلسل چل رہا ہوں آرہا ہوں

---

(۱) ماہ نامہ پیام عرفات، خصوصی اشاعت بہ یاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی، ص:۱۸

زندگی کے آخری عرصے میں مولانا خصوصی طور پر یہ دعا بھی کرنے لگے تھے "یا اللہ! کچھ مہلت مل جائے تو یہ کام اور پھیل جائے۔" کبھی کبھی اپنے قریبی لوگوں سے فرماتے تھے کہ "وقت کم ہے اور کام زیادہ۔"(۱) یعنی وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا وقت قریب ہے اور انھیں رب کے حضور حاضر ہونا ہے۔

علالت

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی وفات کے کچھ عرصے بعد مولانا عبداللہ حسنی قائد ملت اسلامیہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ساتھ ایک علمی و دعوتی سفر پر جنوبی افریقہ تشریف لے گئے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد انھیں بخار آیا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ کافی دنوں بعد اترا اور کئی ماہ تک اپنا اثر چھوڑ گیا۔ ابھی اس کم زوری سے پوری طرح نجات نہیں ملی تھی کہ مولانا ذیابیطس (Sugar) کے مریض ہو گئے، جس سے جسمانی کم زوری میں اضافہ ہو گیا۔ ویسے بھی مولانا کوئی جسیم و ضخیم نہ تھے۔ بچپن ہی سے دبلے پتلے تھے اور چشمہ بھی لگاتے تھے۔ لیکن اس بیماری کے بعد شوگر کے مریض ہو جانے سے اندرونی طور پر بھی کم زور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود دعوتی سرگرمیاں پورے زور شور کے ساتھ جاری رہیں۔ کم زوری اور بیماری انھیں ایک لمحے کے لیے بھی دعوت سے دور نہ رکھ سکی۔ بیماری، کم زوری اور دعوتی و اصلاحی جدوجہد کے ساتھ انھوں نے تقریباً ۱۳ سال گزارے اور ۲۰۱۲ء تک پہنچ گئے۔

سفر حج

۲۰۱۲ء مولانا کی زندگی کا نہایت اہم سال ہے۔ اس میں انھوں نے سفر حج بھی کیا اور سفر آخرت کے لیے تیاری بھی کی۔ مولانا اس سال اپنی اہلیہ محترمہ اور دوسرے افراد خاندان کے ساتھ سفر حج پر روانہ ہوئے۔ یہ ان کا آخری حج بھی تھا اور آخری سفر حجاز بھی۔

---

(۱) یہ بات مولانا بلال عبدالحئ حسنی سے مولانا عبداللہ حسنی کے ساتھ رہنے والے ہمارے نومسلم بھائی عبداللہ پرتاپ گڑھی نے بیان کی۔ اجمل

اس مبارک سفر کے دوران حرمین شریفین میں یک سوئی اور اطمینان کے ساتھ عبادت کرنے کا موقع بھی ملا۔ کئی جگہ مولانا کے خطبات ہوئے۔ بیعت ہونے والوں کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ وہاں کے بہت سے علماء وطلبہ نے اجازت حدیث بھی لی۔ متعدد مشائخ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ گویا مولانا نے بیت اللہ اور روضۂ رسول اللہ پر آخری حاضری بھی دی اور وہاں والوں کو آخری پیغام بھی دیا۔ کیوں کہ اس کے بعد انھیں کبھی اس سرزمین پر حاضری نہیں دینی تھی۔ اس سرزمین اور وہاں کے باشندوں کو آخری سلام کر کے مولانا بہ خیر وعافیت اپنے ملک واپس آ گئے۔

مرض وفات

۳؍مارچ ۲۰۱۲ء سے مولانا نے مہاراشٹر کا دس روزہ دعوتی سفر شروع کیا۔[1] یہ سفر پیام انسانیت کے لیے کیا گیا تھا، جس میں انھوں نے تقریباً ۲ درجن اجتماعات میں شرکت کی۔ مخلوط اجتماعات کو انسانیت کا بھی پیغام بھی دیا اور اسلام کی تعلیمات سے بھی واقف کرایا۔ ان جلسوں میں غیر مسلموں کی دل چسپی باعث حیرت بھی رہی اور ہمت افزا بھی۔ کچھ جلسوں میں دس دس ہزار کا مجمع ہو گیا۔ اسی دورے میں مولانا ناگپور پہنچے۔ وہاں کے دورانِ قیام رات میں پیٹھ کے بائیں حصے میں شدید تکلیف ہوئی، جو رات بھر رہی۔ لیکن قربان جایئے اس عظیم داعی اسلام کی قوت ایمانی اور جذبۂ دعوت کے کہ اس نے اس سخت تکلیف کو بھی برداشت کر لیا اور اپنے پروگرام میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔ ۱۳؍مارچ کو ساڑھے چار ہزار کلومیٹر کی مسافت طے کرتا ہوا مولانا کا کاروانِ دعوت وانسانیت آندھرا پردیش کے دارالسلطنت حیدرآباد پہنچ کر دورے کے اختتام کو پہنچا۔ وہاں سے مولانا اپنے وطن تشریف لے آئے۔

---

(۱) اس یادگار سفر میں معروف عالم دین مولانا عزیز الحسن صدیقی کے صاحب زادے برادر محترم مولانا سعود الحسن صدیقی ندوی بھی ساتھ تھے۔ اس سفر کی تفصیلات انھوں نے اپنے مضمون میں بھی بیان کیں ہیں اور ''کاروان انسانیت'' نامی کتاب میں بھی۔ اجمل

وطن واپسی کے بعد مولانا کی مشغولیات حسب سابق جاری رہیں۔ مشغولیات کے ساتھ ساتھ جس بیماری نے ان کے جسم پر دستک دی تھی وہ بھی باقی رہی۔ تکلیف آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی۔ اتنی بڑھ گئی کہ کروٹ لینا بھی دشوار ہوگیا۔ اس وجہ سے سونا بھی کم ہوتا چلا گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ جب تکلیف ہوتی اور اس پر دم کیا جاتا تو خاصا افاقہ ہوجاتا تھا۔ اس کے باوجود مولانا اپنی تمام سرگرمیاں بھی بہ دستور جاری رکھے ہوئے تھے۔ گویا وہ بیماری سے پنجہ آزمائی کررہے ہوں۔ وہ کسی طرح اپنی دعوتی سرگرمیوں اور ندوے کی تدریس کے سلسلے کو موقوف کرنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن یہ بیماری بھی کوئی عام بیماری نہ تھی۔ یہ وہ بیماری تھی، جو انھیں اس دنیا سے لے جانے آئی تھی۔ ان کی ایک دوسرگرمیوں کو نہیں بل کہ سرگرمیِ حیات کا سلسلہ ہی ختم کرنے آئی تھی۔

آخری رمضان

اسی درمیان رمضان کا مبارک مہینہ آپہنچا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس نیک بندے کو دنیا سے جاتے جاتے کسی سعادت سے محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ایک سال پہلے حج کرایا، اپنے گھر بلایا، اپنے محبوب کے در کی زیارت کرائی، اس کے بعد دعوتی سرگرمیوں کا ایک بڑا موقع دیتے ہوئے مہاراشٹر کا یادگار دورہ کرایا، ہزار ہا ہزار انسانوں کو درس انسانیت اور پیغام آدمیت دینے کا موقع فراہم کیا اور اب رمضان کے مبارک مہینے سے بھی محروم نہ ہونے دیا۔ رمضان کے مہینے میں تکیہ شاہ علم اللہ میں مولانا نے ۳۵ سال سے جاری درس حدیث کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ پورے رمضان تکیہ آنے والوں کو رسول کریم ﷺ کے ارشادات سنا سنا کر احکام الٰہی کے کامل اتباع کی تلقین کرتے رہے۔ پنج وقتہ نمازوں اور روزوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ فرائض کا اہتمام تو انھوں نے بستر پر لیٹ کر بھی کیا۔ فرائض کے علاوہ تلاوت قرآن، تراویح، تہجد، اشراق، چاشت، اوابین، صدقات و ہدایا اور وعظ و تلقین سب کا اہتمام کرتے رہے۔ آخری عشرہ آیا تو اعتکاف میں بھی بیٹھے اور اپنے رب کے دربار میں حاضری سے پہلے دس دن اس کے در پر پڑے رہنے کی مشق کرلی۔

اس پورے مہینے میں آنے والے سیکڑوں، ہزاروں مہمانوں سے ملاقاتیں بھی کیں، لیکن کسی پر اپنی بیماری کی سنگینی ظاہر نہ ہونے دی۔ سب سے ہمیشہ کی طرح حسب مراتب ملتے رہے اور سب کا اکرام کرتے رہے۔ وہ نہ تو تکیے کے معمولات میں ذرا سی بھی خلل اندازی چاہتے تھے اور نہ رمضان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا یہ آخری موقع ہاتھ سے جانے دینا چاہتے تھے۔ رمضان ختم ہوئے۔ مولانا نے اپنے اعزہ واقرباء کے ساتھ زندگی کی آخری عید الفطر پر خوشیاں بانٹیں اور اب حقوق اللہ وحقوق العباد کی تقریباً ادائی کے بعد دربار ایزدی میں حاضری کے لیے تیار ہو گئے۔

بیماری کی شدت

رمضان میں تو انھوں نے اپنی تکلیف کو دوسروں پر ظاہر نہیں کیا تھا، لیکن اب اسے ظاہر نہ کرنا ناممکن سا ہو گیا تھا۔ تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ اتنی زیادہ کہ انھیں ۱۹۷۸ء سے جاری اپنے محبوب تدریسی مشغلے کا سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔ انھوں نے سلسلۂ تدریس کو صرف موقوف کیا تھا، لیکن رب کریم کے دربار میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہ سلسلہ اب منقطع کیا جا رہا ہے۔ آثار وقرائن بتا رہے تھے کہ مولانا پر کسی بد بخت نے سحر کروایا ہے۔ یہ کوئی ناممکن چیز بھی نہیں تھی۔ سحر کا انکار سلف وخلف میں سے کسی نے نہیں کیا اور نہ آج کوئی کر سکتا ہے۔ ہما شما کا تو ذکر ہی کیا؟ سرور کونین، محبوب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات پاک بھی بدخواہوں اور حاسدوں کی طرف سے ہونے والی ساحرانہ شرانگیزیوں سے محفوظ نہیں رہی۔ مولانا بھی تو اسی مقدس ہستی کے نام لیوا تھے۔ صرف نام لیوا نہیں قول وعمل اور حسب ونسب دونوں میں آپ کے حقیقی اور بے آمیز وابستگان میں سے تھے۔ پھر دوسری طرف یہ بھی تو دیکھیے کہ ان کی خدمات اور شہرت ومقبولیت کا دائرہ کتنی تیزی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ چھوٹے انھیں مستقبل میں اپنا قائد ورہنما دیکھ رہے تھے اور بڑے اپنا جانشیں۔ ایسے حالات میں حاسدوں اور مفاد پرستوں کا پورا ٹولہ وجود میں آ جائے تو بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ بہ ہر حال اعزہ واقرباء کے مشورے سے مولانا کو کاندھلہ لے جایا گیا۔ وہاں وہ مولانا افتخار الحسن کاندھلوی

کے زیر علاج رہے۔ مولانا کاندھلوی کے ساتھ ساتھ اس خطے کے تمام بزرگوں کی دعائیں اور نیک خواہشات حاصل ہوتی رہیں۔ وہاں کچھ دن رہ کر مولانا کو خاصا آرام ہونے لگا۔ کاندھلے سے رائے بریلی واپسی کے دوران مراد آباد میں قیام ہوا۔ اعزہ نے سوچا کہ یہاں طبی جانچ بھی کرالی جائیں۔ مولانا بڑی مشکل سے راضی ہوئے۔ الٹراساؤنڈ کرایا گیا تو بائیں طرف ایک گانٹھ کا سراغ ملا۔ یعنی سحر بیماری کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا۔ مشورہ کیا گیا اور ممبئی کے مشہور کینسر ہاسپٹل لے جایا گیا۔ ایک طرف ڈاکٹر سخت تشویش ظاہر کر رہے تھے اور دوسری طرف مولانا تھے کہ ان کی کسی بات یا عمل سے یہ محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ موت کے منہ پر کھڑے ہیں۔ لوگ مسلسل آتے جاتے رہے، ملاقات و زیارت کرتے رہے اور مولانا وہاں بھی سب کو نوازتے رہے۔ سب کو توحید خالص اور ایمان کامل کی تلقین کرتے اور اس انداز سے کرتے کہ لوگ تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول جاتے کہ وہ کسی ایسے شخص کے سامنے بیٹھے ہیں جو چند دن کا مہمان ہے اور اس بات کا خود سے بھی اندازہ ہے۔

''کام ہمارے بعد بھی ہوتا رہے گا''

اسی دوران ایک دن مولانا کے مرض وفات میں ان کے رفیق خاص مولانا خالد بیگ ندوی نے ان سے کہا کہ ''اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو جلدی شفا دے دے، تاکہ آپ کا پھیلا ہوا کام جاری رہے۔'' اس پر مولانا نے فرمایا: ''کام کسی پر منحصر نہیں ہوتا۔ کام ہمارے بعد بھی ان شاء اللہ ہوتا رہے گا۔'' یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے، اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے، جو یہ بتاتے ہیں کہ مولانا رب کریم کی بارگاہ میں حاضری کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

آخری عید

اسی دوران عید الاضحیٰ آ پہنچی اور مولانا عید سے ایک دن پہلے رائے بریلی تشریف لے آئے۔ ممبئی پہنچنے کے بعد تکلیف پھر بڑھ گئی تھی اور اب بھی جاری تھی۔ علاج میں بھی

کوئی کسر نہیں چھوڑی جارہی تھی۔ ہومیوپیتھی، ایلوپیتھی اور یونانی سب چلتے رہے۔ کاندھلے کے مزید اسفار بھی ہوئے اور بیماری میں وقتاً فوقتاً کمی بھی محسوس ہوتی رہی۔ لیکن یہ تو مرض وفات تھا، جس کا ختم ہونا ناممکن تھا۔ مولانا نے اہل خانہ کے ساتھ زندگی کی آخری عید منائی لیکن جسم پوری طرح بیماری زدہ نظر آنے لگا تھا۔ غذا بس برائے نام رہ گئی تھی۔ پورے پورے دن میں کبھی صرف دو چار چمچ اور کبھی ایک آدھ پیالی کسی مشروب کی لے لیا کرتے تھے۔ گویا رب کریم انہیں اُس دنیاوی رزق سے آہستہ آہستہ دور کررہا تھا، جو جسم میں تعفن اور نجاست کا سبب بنتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ غذا برائے نام ہوگی تو صحت بھی بس نام کی رہ جائے گی۔ مولانا بھی اسی صورت حال سے گزر رہے تھے۔ البتہ اب تک نماز باجماعت کا اہتمام مسجد میں فرمارہے تھے۔ کچھ دن بعد کم زوری اور بڑھ گئی تو اپنی قیام گاہ پر ہی جماعت کا اہتمام کرانے لگے۔ کھڑے ہونے میں سخت تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن کھڑے ہوکر ہی نماز پڑھتے رہے۔ کچھ دنوں بعد یہ بھی ناممکن ہوگیا تو بیٹھے بیٹھے پڑھنے لگے۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ بیٹھنا بھی نہایت دشوار ہونے لگا۔ لوگوں نے بار بار کہا کہ لیٹے لیٹے نماز پڑھ لیا کریں لیکن اس پر کسی طرح راضی نہ ہوئے اور آخری وقت تک بیٹھ کر ہی نمازیں پڑھیں، صرف بیٹھ کر ہی نہیں، باجماعت بھی۔ یعنی ان دو عزیمتوں کو آخری دم تک نہیں چھوڑا۔

صبر و رضا اور اتباع سنت

اصحاب معرفت اور اللہ تعالیٰ کے نیک و مقرب بندوں کے آخری لمحات ان کی زندگی کا خلاصہ ہوتے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اہل معرفت و محبت اور اللہ تعالیٰ کے مخلص و مقبول بندوں کے انتقال کا وقت وہ خاص لمحہ ہوتا ہے، جس میں بلند و لطیف معانی مثلاً محبت و وفا، شوقِ لقاء، اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین کامل اور اس کی خوشنودی و رضا کی طلب زندہ اور متحرک ہوکر اپنی سب سے دل آویز شکل میں سامنے آتی ہے، یہ وہ ساعت ہے،

جب وہ معانی وحقائق جس کے لیے انھوں نے زندگی بھر مجاہدہ کیا تھا، اور اپنے کو اس میں فنا کر دیا تھا ان کو اپنے جلو میں لے لیتے ہیں اور جس دن کے لیے وہ دن گن رہے تھے اور اس وقت کے وہ اس طرح منتظر تھے، جس طرح شام ہوتے وقت پرندا اپنے آشیانے کے لیے بے تاب ہوتا ہے، وہ وقت ان کو نصیب ہوتا ہے۔ اس وقت ان کی پوشیدہ وساکن محبت جوش مارنے لگتی ہے اور ان کے اندر سرور ومستی کی ایک غیر معمولی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس وقت ان پر بعض ایسے احوال ظاہر ہوتے ہیں کہ جس پر دنیاوی عیش وتنعم کے پروردہ لوگوں کو بھی رشک آتا ہے اور ان کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کو بھی یہ مرتبہ حاصل ہو اور مقبولیت کی ان علامتوں سے وہ بھی سرفراز ہوں، جو حاصل زندگی ہے۔"(۱)

آخری وقت میں مولانا عبداللہ حسنی کے بھی حب الٰہی اور کامل اتباع سنت کے بہت سے واقعات پیش آئے۔ نماز بیٹھ کر پڑھنے میں تکلیف ہونے لگی تو مولانا افتخار الحسن کاندھلوی سے خصوصیت کے ساتھ گزارش کی کہ "نماز کے لیے دعا کریں کہ وہ سکون سے ہو جایا کرے۔" کوئی بھی خیریت معلوم کرتا تو بڑے اطمینان سے فرماتے "ماشاء اللہ بہتر ہے"۔ بالخصوص ان کے چچا، خسر اور مخدوم سید الامۃ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی عیادت کے لیے تشریف لاتے تو اٹھنے کی کوشش کرتے۔ مولانا کے آنے کی اطلاع ملتی تو فرماتے: "عموجان آرہے ہیں، ہمیں بٹھادو"۔ صرف اس لیے کہ نہ تو مولانا کے سامنے لیٹے رہنا پڑے اور نہ بیماری کی نزاکت ان کے ذہن ودماغ کو افسردہ کرے۔ وفات سے ایک روز قبل اہلیہ محترمہ کو تاکید کی کہ "الحمدللہ کی ایک تسبیح روزانہ پڑھنے کا معمول بنالو" صرف اس لیے کہ ناشکری کا ایک لفظ بھی ان کی زبان سے ادا نہ ہو سکے۔ اکلوتے صاحب زادے سید محمد حسنی وفات سے ایک روز قبل ملنے کے لیے آئے تو کم عمری کی وجہ سے سلام کرنا بھول گئے۔ مولانا نے اس عالم میں بھی یہ گوارا نہ کیا۔ واپس بھیجا کہ سلام کرو اور پھر اندر آؤ۔ جب تک زبان ہلانے کی سکت باقی رہی ذکر واذکار میں مشغول رہے۔ جب بولنا بھی دشوار

(۱) تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص: ۱۶۴

ہونے لگا تو ذکر خفی کا اہتمام کرنے لگے۔ ہر سانس کے ساتھ اسم ذات ادا کرتے جس کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ایک روز اپنے رفیق خاص عبداللہ پرتاپ گڑھی سے فرمایا بھی کہ ''ذکر خفی کی مشق اب کام آرہی ہے۔'' ایک سے زائد مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ اس بیماری میں ہم کو خواجہ محمد معصوم سرہندی کے ایک مکتوب سے بڑی تسلی ہوئی کہ ''بعض مقامات کے حصول کی بڑی خواہش تھی، جو ریاضات ومجاہدات سے حاصل نہیں ہو پا رہے تھے، لیکن بیماری میں وہ دولت حاصل ہوگئی۔'' کیا یہ بات کسی کرامت سے کم ہے کہ ایسی شدید بیماری کے دوران تین ماہ میں ان کی کوئی ایک نماز بھی جماعت کے بغیر نہیں ہوئی؟ عام نمازیں تو قیام گاہ میں پڑھنے لگے تھے۔ لیکن جمعہ کے لیے کسی نہ کسی طرح مسجد پہنچ ہی جاتے تھے۔ ہاں! زندگی کا آخری جمعہ جماعت سے نہ پڑھ سکے۔ یہ بیماری کا وہ مرحلہ تھا جب ہاتھ پیر ہلانے میں بھی شدید تکلیف ہوتی تھی۔ اس جمعہ میں بھی اصرار کیا کہ جماعت کی کوئی صورت ہو تو ہمیں لے چلو۔ لیکن یہ کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ ان کے ساتھ رہنے والوں نے ایک ایک کر کے الگ الگ مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کی اور مولانا کو تنہا نماز پڑھنی پڑی۔ یہ ان کی زندگی کا آخری جمعہ تھا۔ حجام کو بلوایا، حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے اور جمعہ کی تیاری کی۔ جمعہ کی سنتیں جہاں تک ادا ہو سکتی تھیں، ادا کیں۔

اویس زمانہ مولانا شاہ فضل رحماں گنج مراد آبادی کے تذکرے میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ایک سبق آموز واقعہ لکھا ہے۔ عالم نزع میں جب ان کے کپڑے بدلے جانے لگے اور کوئی معتقد پاجامہ پہنانے لگا تو اس نے پہلے دایاں پائچہ اتارنا شروع کر دیا۔ پیر گنج مراد آباد نے عالم نزع میں بھی یہ گوارا نہ کیا کہ پائے جامہ اتارنے کی سنت چھوڑی جائے۔ کسی طرح زور لگا کر سختی سے پیر ہلایا۔ خادم کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے سنت کے مطابق پہلے بایاں پائچہ اتارا۔ بالکل یہی واقعہ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ آخری ایام میں جب زبان ہلانا بھی دشوار ہو رہا تھا، کسی نے پہلے دائیں پیر کا موزہ اتارنا شروع کر دیا۔ مولانا اس

حالت میں بھی پیر واپس کھینچنے لگے۔ خادم کو تنبیہ ہوئی اور اس نے پہلے بایاں موزہ اتارا۔

اسی طرح اس عالم میں بھی عیادت کرنے والوں کا حتی الامکان اکرام کرتے رہے۔ تکلیف ہوتی تھی، لیکن مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ خیریت پوچھنے اور مسکرا کر خیریت بتانے کا بھی حتی الامکان اہتمام کرتے رہے۔

آخری رات

ان تمام حالات میں زندگی کی آخری رات بھی آ گئی۔ ان کے چھوٹے بھائی اور جانشین مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی ندوی نے یہ حیرت انگیز بات بھی بیان کی ہے کہ آخری دو تین دنوں میں وقفے وقفے سے سامنے دیکھتے اور سامنے کی طرف ہاتھ بڑھانے لگتے تھے، جیسا کہ کسی کے استقبال کے لیے بڑھایا جاتا ہے۔ پوچھا جاتا تو کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ بہت دنوں سے کھانے پینے کا معمول ختم ہو گیا تھا۔ دن دن بھر میں مشکل سے کسی مشروب کی آدھی پیالی لیتے تھے لیکن آخری رات عجب معاملہ ہوا۔ تقریباً ہر گھنٹے پر زم زم مانگتے اور خلاف معمول ایک آدھی پیالی پی لیتے تھے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ کئی ماہ سے حق تعالیٰ ان کے جسم کو نجاست میں تبدیل ہو جانے والی دنیاوی غذاؤں سے دور فرما رہا تھا اور اب اس نے آخری لمحات میں زم زم کے ذریعے ان کے اندرون کو پاک صاف بھی فرما دیا۔

آخری نماز

رات گزری اور صبح آئی۔ مولانا نے فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ یہ زندگی کی آخری نماز تھی۔ اس کے بعد ان کی روح کو علامتی طور پر نہیں، بل کہ بہ نفس نفیس دربار الٰہی میں حاضری دینی تھی۔

وفات

صبح کے ساڑھے نو بجے ہوں گے کہ مولانا نے اچانک قرآن مجید سننا شروع کر دیا۔ دو چار منٹ نہیں، پورا ایک گھنٹہ۔ پھر کسی نے سورۂ یٰس شروع کی۔ اِدھر یٰس ختم ہوئی،

اُدھر مولانا نے آخری سانس لی۔ نہ کوئی تکلیف، نہ گھبراہٹ، نہ رنج والم اور نہ کسی طرح کا حزن و ملال۔ باجماعت نمازیں ادا کرتے، سنتوں کا اہتمام کرتے، ظاہر و باطن کو پاک کرتے اور قرآن مجید کی تلاوت سنتے ہوئے پورے سکون واطمینان کے ساتھ محبوب حقیقی سے ابدی وصال کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہ حادثہ سحر نرسنگ ہوم، لکھنؤ میں ۱۷/ربیع الاول ۱۴۳۴ھ بمطابق ۳۰/جنوری ۲۰۱۳ء کو بدھ کے دن پیش آیا۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے لیٹے لیٹے اچانک مولانا سے کسی ہاتفِ غیبی نے کہا ہو کہ تیار ہو جاؤ! بارگاہِ ایزدی میں حاضری کا وقت آ گیا ہے اور مولانا نے دنیا والوں سے کہا ہو کہ بس آخری مرتبہ مجھے قرآن سنا دو۔ اس کے بعد میں کوئی کام نہ کہوں گا۔ مجھے دنیا کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے گی اور مسلسل ایک گھنٹے تک قرآن سنتے سنتے سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے ہوں۔ گویا:

روح نکل کر باغِ جہاں سے باغِ جناں تک جا پہنچے
چہرے پہ اپنے میری نگاہیں اتنی دیر تو رہنے دو(۱)

وفات کے بعد

مولانا کی علالت کی اطلاع دنیا بھر میں پہنچ چکی تھی لیکن اس بات کی امید کسی کو بھی نہیں تھی کہ یہ محبوب شخصیت جس سے سب نے بے شمار امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، بولتے بولتے اچانک خاموش ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ ان کے اہل خانہ اور مستقل تیمارداری کرنے والے وابستگان اگرچہ حالت کی نزاکت اور وفات کے مختلف اشارے دیکھ رہے تھے لیکن یہ امید سب کو تھی کہ دیر سویر مولانا صحت یاب ہو ہی جائیں گے۔ پھر کسی کے ذہن میں وفات کا خیال آتا بھی تھا تو وہ کانپ جاتا تھا اور وسوسۂ شیطانی سمجھ کر اس کو دفع کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس الم ناک حادثے کی خبر جس کو ملی وہ دھک سے رہ گیا۔ کسی کو پہلی بار میں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ حادثہ پیش آ چکا ہے۔ ایک دوسرے سے اس واقعے کی تصدیق کرنے اور اس کے بعد دوسروں کو اطلاع دینے کا سلسلہ اس برق رفتاری

---

(۱) علالت سے وفات تک کے حالات کا اکثر حصہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کے مضمون سے مستفاد ہے۔ اجمل

سے چلا کہ منٹوں میں یہ خبر بیرون ممالک تک پہنچ گئی۔ کتاب کے آغاز میں ہم نے بیان کیا ہے کہ ہمیں یہ خبر مدینہ منورہ سے تبوک جانے والے راستے میں ملی۔ جب یہ اطلاع ملی اس کے چند منٹ پہلے ہی یہ حادثہ پیش آیا تھا اور اس وقت ہم سنسان صحراؤں سے گزر رہے تھے۔ اِدھر اطلاع ملی اور اُدھر چند منٹوں کے اندر ہی سعودیہ عربیہ کے ایک سے زائد دوستوں کا فون آیا۔ کسی کا تصدیق کے لیے اور کسی کا خبر دینے کے لیے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ خبر دنیا بھر میں کس تیزی سے پھیلی۔ جنگل میں آگ کی طرح خبر کا پھیلنا یہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم جیسے نہ جانے کتنے وابستگانِ ندوہ ہوں گے جنھیں مختلف ممالک میں یہ خبر اسی برق رفتاری سے ملی ہوگی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ملک الموت نے مولانا کی مبارک روح کو ساتھ لیا اور دنیا بھر میں اعلان کرتے چلے گئے کہ ہم تمھارے محبوب کو اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں۔

اس خبر کا عام ہونا تھا کہ ملک کے مختلف حصوں سے لوگ جوق در جوق لکھنؤ یا رائے بریلی پہنچتے گئے۔ کوئی پیدل، کوئی دو پہیوں کی کسی سواری سے، کوئی چار پہیوں کی گاڑیوں سے، کوئی ریل میں سوار ہو کر اور کوئی جہاز میں اڑ کر۔ جس کو جو مناسب لگا وہ اسی ذریعے سے آخری زیارت اور جنازے میں شرکت کے لیے پہنچنے لگا۔ مدارس میں چھٹی کر دی گئی۔ بے شمار تعلیمی مراکز اور دعوتی و اصلاحی ادارے بند رہے۔ اخباری نمائندے اور میڈیا سے وابستہ افراد تفصیلات معلوم کرنے کے لیے نکل پڑے۔ تعزیتی جلسوں اور ایصالِ ثواب کی محفلوں کا سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اگلے دن اخبارات میں وفات کی جو خبریں شائع ہوئیں ان کے ساتھ ساتھ تعزیتی جلسوں کی رپوٹیں بھی شائع ہوئیں۔ غرض یہ کہ ہندستان کے تمام دینی، علمی اور دعوتی حلقوں میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اس حادثے کو سب نے محسوس کیا اور بہت محسوس کیا۔ ہمارے وہ علماء و مشائخ جو سفر کرنے سے معذور ہیں، وہ تڑپ کر رہ گئے اور ٹیلی فون یا خطوط کے ذریعے تعزیت کی۔ جو لوگ حرمین شریفین کے اطراف میں تھے انھوں نے کثرت سے عمرے ادا کیے۔ خود راقم الحروف کے علم میں ایسے دس بارہ افراد ہیں جنھوں نے مولانا کے لیے عمرے ادا کیے۔ جامعہ اسلامیہ

مدینہ منورہ کے طلبہ نے مسجد نبوی میں غائبانہ نماز جنازہ کا بھی اہتمام کیا اور مدینہ منورہ ہی میں ایک تعزیتی جلسے کا بھی۔ اس طرح کے تعزیتی جلسے دوسرے عرب ممالک میں بھی ہوئے۔ ہر شخص کو مولانا کی وفات کا غم اپنا محسوس ہوا۔ دل پر سخت چوٹ لگی۔ نہ جانے دنیا بھر میں کتنے لوگوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ پڑے۔ آنکھوں سے آنسو تو سب نے نہ بہائے ہوں گے، لیکن سب کے دل خون کے آنسو ضرور روئے ہوں گے۔

پہلی نماز جنازہ

اسپتال سے جنازہ لکھنؤ میں مولانا کی رہائش گاہ خاتون منزل لے جایا گیا۔ وہیں غسل دیا گیا، ہزاروں لوگوں نے آخری دیدار کیا اور عصر کے بعد ندوۃ العلماء لے جایا گیا۔ وہاں طلبہ بھی بے حال تھے، اساتذہ بھی اور اہل خانہ کا تو پوچھنا ہی کیا۔ جنازے میں شریک متعدد لوگوں نے بتایا کہ ندوے کا وسیع و عریض میدان تقریباً پورا بھر چکا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ندوے میں آئے دن پڑھے جانے والے جنازے مہمان خانے کے سامنے یعنی مسجد کے باہر داہنی طرف رکھے جاتے ہیں۔ لیکن اژدہام کی وجہ سے مولانا کے جنازے کو میدان میں رکھنا پڑا۔ میدان میں کتنے لوگ نماز پڑھ سکتے ہیں یہ بات ہم پختگی کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگوں نے شرکائے جنازہ کی تعداد ۳۵ سے ۴۰ ہزار تک بیان کی ہے۔ اتنا طے ہے کہ ندوے کا میدان تقریباً بھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر شرکائے جنازہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا کے استاد اور ان کے والدِ محترم کے جگری دوست مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے امامت فرمائی۔ نماز جنازہ کے بعد کتنے ہی لوگوں کو دہاڑیں مار مار کر روتے دیکھا گیا۔ ان میں طلبہ بھی تھے، مریدین بھی تھے اور وہ نومسلم بھی جن کے لیے مولانا باپ سے کم نہ تھے۔ یہ پہلی نماز جنازہ تھی۔ اس کے بعد جنازے کو میدان سے اٹھا کر ندوے کے مرکزی دروازے پر کھڑی ایمبولینس تک لے جانا تھا۔ تاکہ وہاں سے انہیں تکیہ کلاں رائے بریلی لے جایا جا سکے۔ میدان کے دروازے اور ندوے کے مرکزی دروازے کی درمیانی مسافت ایک دو منٹ سے زیادہ کی نہیں ہے۔ لیکن بتانے والوں نے بتایا ہے کہ یہ

مسافت ایک یا سوا گھنٹے میں طے کی گئی۔ انسانوں کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈ آیا تھا۔ ہر شخص غم زدہ اور بے حال تھا۔ معتبر ترین علماء (جن میں مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور مولانا برہان الدین سنبھلی جیسے اساطین علم و فضل شامل ہیں) نے بیان کیا ہے کہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے جنازے کے بعد اتنی بھیڑ کسی اور جنازے میں نہیں دیکھی گئی۔

دوسری نماز جنازہ

ندوے میں نماز جنازہ کے بعد جسد خاکی کو آبائی گاؤں تکیہ کلاں رائے بریلی لے جایا گیا۔ وہاں بھی بہت بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ تکیے کی مسجد کے داہنی طرف قبر تیار کرائی گئی۔ رات کے دس بجے مولانا کے چچا، خسر، مربی اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے قائد اعلیٰ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے جنازے کی امامت فرمائی۔ بیٹوں سے زیادہ محبوب بھتیجے اور مستقبل میں بے شمار امیدوں کے مرکز کو سپرد خاک کرنا کتنا جاں کاہ ہوتا ہے، یہ مولانا کو دیکھنے والے محسوس کر سکتے تھے۔ اس تلخ ترین تجربے کا صحیح اندازہ مولانا ہی کو ہوا ہوگا۔ لیکن ایسے دل دوز واقعے کے باوجود زبان یا عمل سے ادنیٰ ترین ناشکری اور بے صبری کا اظہار نہ کرنا ہم جیسے ہزاروں لاکھوں عقیدت مندانِ رابع کے لیے ایک عظیم درس رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مدظلہ العالی کا اقبال بلند کرے اور ان کے سایۂ مبارکہ کو پوری ملت اسلامیہ ہندیہ پر صحت و عافیت کے ساتھ تادیر باقی رکھے۔ آمین

مولانا عبداللہ حسنی کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا اور ان کی جسمانی زندگی کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن مولانا جیسے لوگ مرتے کہاں ہیں؟ ان کا جسم ضرور غائب ہو جاتا ہے لیکن پیغام ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

اخبارات و رسائل کا خراج

مولانا کے حادثۂ وفات پر اخبارات و رسائل نے کھل کر خراج عقیدت پیش کیا۔ وفات کے اگلے دن تمام اخبارات میں حادثۂ وفات کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔

بالخصوص اردو میڈیا نے بڑے اہتمام کے ساتھ خبریں شائع کیں۔ چوں کہ مولانا کی وفات صبح کے وقت ہوئی تھی اس لیے اخبارات میں وفات کی خبروں کے ساتھ ساتھ تعزیتی جلسوں کی خبریں بھی شائع ہوئیں۔ تفصیل کے ساتھ تمام اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کا جائزہ تو نہیں لیا جاسکتا البتہ ہم اردو کے قدیم، باوقار اور سب سے معروف اور سنجیدہ اخبار روزنامہ انقلاب (آغاز: ۱۹۳۸ء) کا حوالہ دیتے ہیں۔ ۳۱؍جنوری کی اشاعت میں اس اخبار کے صفحۂ اوّل پر چار کالموں پر مشتمل جلی الفاظ میں یہ خبر شائع ہوئی:

ندوۃ العلماء کے استاد حدیث اور مشہور داعی مولانا عبداللہ حسنی کا انتقال

اسی اشاعت میں دوسرے صفحے پر ۳ کالموں پر مشتمل یہ خبر تھی:

مولانا عبداللہ محمد الحسنی کے انتقال سے ماحول غمگین،
علماء نے ان کی موت کو قوم کا عظیم خسارہ قرار دیا

آگے چل کر اسی اشاعت میں صفحہ نمبر ۵ پر ۵؍کالموں پر پھیلی ہوئی یہ خبر تھی:

مولانا عبداللہ حسنی ندوی علم کے سپاہی اور دین کے سچے علم بردار تھے

یہ تینوں خبریں ایک اخبار کی ایک ہی اشاعت کی ہیں۔ ان سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اخبارات نے مولانا کی وفات اور تعزیتی جلسوں کی خبروں کو کتنی اہمیت دی اور کس اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ تقریباً یہی صورت حال تمام روزناموں کی رہی۔

روزناموں کے علاوہ ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہانہ رسائل و جرائد میں بھی مولانا کی شخصیت اور خدمات پر تفصیلی مضامین شائع ہوئے۔ شاید ہی کوئی معروف اور غیر جانب دار جریدہ ہوگا، جس میں مولانا کے متعلق کوئی مضمون نہ شائع کیا گیا ہو۔ بہت سے رسالوں نے خصوصی گوشے اور باقاعدہ نمبرات نکالے۔ ان میں سے جن تک ہماری رسائی ہوسکی وہ یہ ہیں:

(۱) ماہ نامہ پیام عرفات

یہ رسالہ ہندستان کے اہم علمی و تحقیقی ادارے مرکز الامام ابی الحسن الندوی کا ماہانہ ترجمان ہے، جو دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے نکلتا ہے۔ اس رسالے نے مولانا پر شان دار خصوصی نمبر نکال کر مولانا سے جسمانی و روحانی تعلقات کا حق ادا کر دیا۔ اس میں شامل مضامین کی تعداد ۸۰ ہے۔ ساتھ ہی ایک اداریہ، زندگی کا خاکہ، دو نظمیں، تعزیتی مکتوبات، اور کچھ ملفوظات بھی شامل اشاعت ہیں۔ یہ شمارہ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور مولانا کے متعلق بھرپور معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس میں لکھنے والوں میں ملک و بیرون ملک کے علماء، صلحاء اور قائدین بھی ہیں اور مختلف جماعتوں، مدرسوں اور تنظیموں کے ذمے دار بھی۔ ساتھ ہی مولانا کے بہت سے تلامذہ اور اہل خانہ کے بھی مضامین شامل ہیں۔ ابتداء میں ۴ر صفحات پر مشتمل دعوت کے متعلق مولانا کی تحریر اور جگہ جگہ دیے گئے مولانا کے اقوال نے اس خصوصی اشاعت کی اہمیت اور وقار میں اضافہ کیا ہے۔

(۲) ماہ نامہ المؤمنات

یہ رسالہ لڑکیوں کے معروف دینی ادارے جامعۃ المؤمنات الاسلامیہ، لکھنؤ کا ماہانہ ترجمان ہے۔ اس ادارے کے بانی مولانا محمد رضوان ندوی اور مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نہایت قریبی دوست تھے، جس کی وجہ سے مولانا عبداللہ حسنی نے آخر دم تک ادارے اور اس کے ترجمان المؤمنات کے ساتھ مخلصانہ تعلقات رکھے۔ ان تعلقات کا حق تھا کہ ادارہ اپنی محسن شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرے۔ چناں چہ المؤمنات کی مارچ اور اپریل کی مشترکہ اشاعت کو ''خصوصی اشاعت بہ یاد حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی'' کے طور پر شائع کیا گیا۔ اس میں اداریے کے علاوہ ۲۰ر مضامین شامل ہیں۔ ان میں کئی اہم مضامین ایسے بھی ہیں جو دوسرے رسائل میں شائع نہیں ہوئے۔ جس کی وجہ سے ۸۰ صفحات پر مشتمل یہ خصوصی نمبر بھی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ دو رسالے وہ تھے جنھوں نے خصوصی نمبرات نکالے اور ہمارے علم میں آ سکے۔

ان کے علاوہ کچھ رسائل نے خصوصی گوشے شائع کر کے مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ان میں ہماری معلومات کی حد تک تین رسالے قابل ذکر ہیں:

(۱) پندرہ روزہ تعمیر حیات

یہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ کا اردو ترجمان ہے، جسے مولانا عبداللہ حسنی کے والد گرامی مولانا محمد الحسنی نے جاری کیا تھا۔ اس میں مولانا کی وفات پر ایک خصوصی گوشہ شائع کیا گیا، جس میں اداریے اور ایک نظم کے علاوہ چھ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مدیر مسئول مولانا شمس الحق ندوی کا اداریہ اور ڈاکٹر حافظ ہارون رشید صدیقی کا مضمون اس لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ دونوں حضرات مولانا عبداللہ حسنی کے اساتذہ بھی ہیں۔

(۲) ماہ نامہ ارمغان ولی اللہ

یہ جمعیت شاہ ولی اللہ پھلت، مظفر نگر کا ماہانہ ترجمان ہے۔ اس رسالے کے خصوصی گوشے میں اداریے کے علاوہ چھ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

(۳) الاصلاح

جمعیۃ الاصلاح، ندوۃ العلماء کے طلبہ کی انجمن ہے۔ جو ابتداء ہی سے طلبہ کے اندر تحریری و تقریری صلاحیتیں پیدا کرتی ہے۔ یہ انجمن ''الاصلاح'' کے نام سے اپنا ایک سال نامہ بھی شائع کرتی ہے، جس میں مختلف موضوعات پر طلبہ کے مضامین ہوتے ہیں۔ اس سال نامے نے اہم اور مستحسن قدم اٹھاتے ہوئے مولانا پر خصوصی گوشہ شائع کیا، جس میں طلبہ کے مضامین شامل ہیں۔ اگر چہ مضامین بہت مختصر ہیں، اس کے باوجود ان کی اہمیت اپنی جگہ ہے، کیوں کہ یہ مضامین تلامذہ کا خراج ہیں۔

یقیناً ان کے علاوہ دوسرے بہت سے رسائل و جرائد نے بھی مولانا کے متعلق یا خصوصی گوشے شائع کیے ہوں گے، لیکن کوشش کے باوجود ان تک ہماری رسائی نہ ہو سکی۔

امتیازات وخصوصیات

داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کو اللہ تعالیٰ نے متعدد امتیازات وخصوصیات سے نوازا تھا۔ ان اوصاف میں سے ایک ایک وصف ایسا ہے کہ اگر کسی انسان کے اندر تنہا بھی پایا جائے تو اسے بے مثال بنادے۔ اس طرح کے متعدد اوصاف کسی کی ذات میں جمع ہو جائیں تو اس کی عظمت وبلندی کا کیا کہنا۔ مولانا عبداللہ حسنی ان باتوفیق بندوں میں سے تھے، جن میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے کئی اوصاف کو جمع فرمادیا تھا۔ مولانا پر لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بیان کرنے والوں نے بہت کچھ بیان کیا ہے۔ کسی نے کسی وصف کو ابھارا ہے اور کسی نے کسی کو۔ یہاں ان تمام اوصاف کو تفصیل سے بیان کرنا مقصود نہیں۔ ہاں، چند ایسے اوصاف کو بیان کیے بغیر رہا بھی نہیں جاسکتا، جنھوں نے مولانا کو بہت کم وقت میں بہت زیادہ مقبولیت، محبوبیت اور مرجعیت عطا کردی تھی۔

(۱) اتباع سنت

مرض وفات کے درمیان گزرنے والے حالات میں اس طرح کے کئی واقعات بیان کیے جاچکے ہیں جن سے مولانا کی سنتوں سے والہانہ تعلق اور وارفتگی کا پتہ چلتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ مرض وفات میں کامل اتباع سنت کا اظہار وہی کرسکتا ہے جو زندگی بھر سنتوں کا متوالا رہا ہو۔ اس کے بغیر مرض وفات جیسے نازک وقت میں چھوٹی چھوٹی سنتوں کا خیال رکھنا ناممکن ہے۔ مولانا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے والے بھی جانتے ہیں کہ وہ ہر چیز

میں سنتوں کا کس قدر اہتمام کرتے تھے۔کھانے پینے، ملنے جلنے، بولنے چالنے، چلنے پھرنے غرض یہ کہ ہر کام میں سنتوں کا اہتمام ان کی شناخت تھی۔وہ ان سنتوں کو اس اہتمام کے ساتھ ادا کرتے تھے کہ دیکھنے والے کو بھی لطف آجاتا تھا اور اس کے دل میں بھی ان سنتوں کے اہتمام کا شوق پیدا ہوتا تھا۔یہ بات پیچھے گزر چکی ہے کہ مولانا چھوٹی چھوٹی سنتوں کو کم تر سمجھ کر چھوڑنے کو بھی ایمان کی کم زوری کی علامت سمجھتے تھے۔[1] وہ کہتے تھے کہ ''جہاں زیادہ روشنی ہوتی ہے وہاں چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نظر آجاتی ہے۔اسی طرح جس کے دل میں ایمان کا نور بہت زیادہ ہوتا ہے وہ چھوٹی سے چھوٹی سنت پر بھی عمل کرتا ہے اور کسی سنت کو کم تر سمجھ کر نہیں چھوڑتا۔'' یہ صرف ایک نظریہ نہیں تھا، بل کہ اس اصول پر مولانا کا عمل بھی تھا۔جو چیزیں سنت نبوی میں نہیں ملتیں، ان میں بھی مولانا سنت کے قریب تر عمل کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔مثال کے طور پر ایک مرتبہ ایک صاحب نے ہدیے کے طور پر کیلے پیش کیے۔مولانا کے حکم سے وہ اہل مجلس میں تقسیم ہوگئے۔جب لوگ کھانے لگے تو مولانا نے فرمایا ''بہتر ہے کہ کیلے کو پورا چھیل کر اور سیدھے منہ کے ذریعے نہ کھایا جائے۔بل کہ کچھ چھیلا جائے اور اس کے بعد ہاتھ سے توڑ توڑ کر منہ میں رکھا جائے۔'' اس طرح کی نہ جانے کتنی چیزیں اور کتنے اعمال تھے جن میں مولانا سنت یا مزاجِ سنت پر عمل کیا کرتے تھے۔

وہ ان لوگوں میں سے بھی نہیں تھے جو سنت کو چند اعمال میں محدود کر دیتے ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ سنت نبوی پوری زندگی کو معتدل انداز میں گزارنے کا جامع ترین طریقہ ہے۔[2] وہ ظاہری سنتوں کے ساتھ ساتھ باطنی سنتوں پر عمل کرنے کو بھی لازم سمجھتے تھے۔ انھیں یہ روش ہرگز پسند نہ تھی کہ انسان چند ظاہری سنتوں کو مضبوطی سے پکڑے رہے اور اس کے قلب و روح مختلف آلائشوں سے آلودہ ہوں۔خاص طور پر معاملات کی صفائی اور

(۱) ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۸۰ پر ''اتباعِ سنت کی تاکید'' کے متعلق مولانا کا اہم ملفوظ۔

(۲) اس سلسلے میں ''کامل اتباعِ سنت کی دعوت'' کے عنوان کے تحت مولانا کا قیمتی ملفوظ صفحہ نمبر ۸۰ پر ملاحظہ ہو۔

رشتے داروں کے حقوق کی ادائی کو وہ سنت مؤکدہ سمجھتے تھے۔ ایسی سنت مؤکدہ جس پر عمل نہ کیا جائے تو انسان کہیں کا نہ رہے۔ زندگی بھر ظاہر و باطن کی تمام سنتوں پر خود بھی عامل رہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے رہے۔

(۲) اعتدال

اعتدال ایک ایسا وصف ہے کہ جس چیز سے بھی جڑ جاتا ہے، اُسے خوب صورت بنا دیتا ہے۔ یہ نبوتِ محمدی کا عطر اور اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ برصغیر میں اعتدال و توازن کی سب سے نمائندہ شخصیت امام ولی اللہ دہلوی کی رہی ہے۔ امام دہلوی کے معتدل فکر اور متوازن مسلک و منہج کو تحریک ندوہ کے بانیوں نے پوری مضبوطی کے ساتھ اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابناء ندوہ کے ذریعے مختلف و متنوع میدانوں میں تعلیمی، فکری، علمی، تحقیقی اور تعارف اسلام کا عظیم کام انجام پایا۔ یہ اعتدال و توازن داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کو بھی اپنے آباء واجداد اور اپنے اساتذہ سے حاصل ہوا۔ پھر کیا تھا؟ مولانا کی زندگی کا ہر پہلو چمک اٹھا اور دعوت و فکر کا ہر گوشہ روشن ہو گیا۔

وہ شخص جس نے مولانا سے صرف ایک ملاقات بھی کی ہوگی، وہ بھی اس بات کی گواہی دے گا کہ ان کی شخصیت ہر طرح کی بے اعتدالی سے پاک تھی۔ ملنے جلنے میں، سلام کرنے یا سلام کا جواب دینے میں، گفتگو میں، تقریروں میں، غرض یہ کہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جو ایک بار مل لیتا تھا، دوبارہ مل کر بار بار ملنا چاہتا تھا۔

میدان خطابت میں بھی وہ بے اعتدالی کا شکار نہیں ہوتے تھے کہ مائک پر کھڑے ہو کر بولنا شروع کریں، تو سب کچھ بھول جائیں اور ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیں۔ وہ بولتے سب کچھ تھے، لیکن اعتدال کے ساتھ۔ کسی شخص، تحریک یا کسی حکومت کی خامیاں بیان کرنے کا موقع آتا تھا، تو ایک ایک کر کے سب کچھ گناتے تھے، لیکن حکمت کے ساتھ۔ یہی معاملہ تحریروں میں بھی تھا۔ کیسا ہی جذباتی موقع آجائے، وہ اعتدال اور عالمانہ وقار

کے خلاف ایک حرف بھی اپنے قلم سے نہیں نکالتے تھے۔ کسی کی دعوت وفکر یا طریقۂ کار سے اختلاف ہوتا، تو ضرورت پڑنے پر اختلاف ظاہر کرتے تھے، لیکن اس کے خلاف غیر سنجیدہ اور غیر معتدل انداز میں زبان وقلم کے دہانے کھول کر مسئلے کو مزید پیچیدہ بنانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تقریروں میں ایسی تاثیر اور کشش تھی کہ اچھے اچھے شعلہ بیان مقرروں کی تقریروں میں نہیں ہوتی۔ اسی طرح ان کی تحریروں سے بھی لوگ تخریب کے بہ جائے تعمیر، اختلاف کے بہ جائے اتحاد اور احتجاج کے بہ جائے محبت ویگانگت کا درس لیتے تھے۔

تدریس، تصوف وسلوک اور میدان دعوت میں اعتدال وتوازن پر گزشتہ صفحات میں خاصی وضاحت کے ساتھ گفتگو ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ایک میدان اور ہے، جس میں اکثر لوگ مسلکِ اعتدال پر قائم نہیں رہ پاتے۔ وہ ہے عائلی اور گھریلو زندگی کا میدان۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ اپنے تلامذہ اور مریدین ومعتقدین کے ساتھ تو بڑی شفقت ونرمی اور محبت وہم دردی کا رویہ رکھتے ہیں، لیکن گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھنے سے پہلے ان تمام جذبات کا چولہ بھی اتار دیتے ہیں۔ بیوی، بچوں، بھائی، بہنوں اور دوسرے اعزہ واقرباء کے ساتھ ان کا رویہ غیر مناسب اور سختی وترشی کا ہوتا ہے۔ چناں چہ دنیا کی تربیت کرنے والے اپنے بچوں کی تربیت نہیں کر پاتے۔ ساری دنیا کو اپنا معتقد بنانے والے، اپنی بیوی اور دوسرے اعزہ واقرباء کے دل میں اپنی عقیدت واحترام پیدا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ صرف اپنے غصے اور ترش روئی سے ان پر حاوی رہتے ہیں۔ لیکن مولانا اس میدان کے بھی فاتح تھے۔ دنیا والے ان سے جتنی محبت وعقیدت رکھتے تھے، اتنی ہی عقیدت ومحبت ان کے اہل خانہ اور اعزہ واقرباء بھی رکھتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ مداہنت اور بے جا رعایت سے کام لیتے تھے۔ وہ روکتے ٹوکتے تو تھے، لیکن حکمت ومحبت کے ساتھ۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے خاندان کے لڑکوں کو فجر کی نماز باجماعت کی پابندی کرنے کے لیے طے کر دیا تھا کہ وہ فجر بعد سب کے ساتھ چائے پئیں گے۔ چائے اپنی اہلیہ محترمہ کے بہ جائے لڑکیوں ہی میں سے کسی سے بنواتے۔ اگر کسی سے نماز

میں تاخیر ہوجاتی تو اس کے ہاتھ کی چائے پینے سے منع کردیتے تھے۔ کہتے تھے کہ "چائے کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔"

یہی اعتدال کھانے پینے، ہنسنے بولنے، طنز ومزاح اور سونے جاگنے میں بھی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال وتوازن ان کی دعوت وفکر کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت سے بھی جھلکنے لگا تھا۔ صرف جھلکنے نہیں، چھلکنے بھی لگا تھا۔ ان کے مزاج وطبیعت کے گوشے گوشے اور جسم کے رگ وریشے میں سرایت کرگیا تھا۔ اسی اعتدال نے ان کی شخصیت اور پیغام میں بے انتہا کشش اور مقناطیسیت پیدا کردی تھی۔

(۳) بے باکی

انتہائی انکسار وتواضع اور جرأت وہمت کے ساتھ مولانا کی شخصیت میں بے باکی کا عنصر بھی وافر مقدار میں پایا جاتا تھا۔ یہ بے باکی ان کی تقریروں میں بھی ظاہر ہوتی تھی اور تحریروں میں بھی۔ نجی مجلسوں میں بھی پائی جاتی تھی اور مکاتیب وخطوط میں بھی۔ وہ جہاں اور جب، جو بیماری یا نقص دیکھتے، اُس کی اصلاح کے لیے ابھارتے۔ نقائص کو بیان کرنے میں وہ بے جا مصلحت یا مداہنت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ لیکن ایسے انداز بیان سے بھی بچتے تھے، جو سننے والے کو تکلیف پہنچائے یا وہ اُسے اپنی ذات پر حملہ سمجھے۔ اس سلسلے میں دہلی میں وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کے سامنے کی گئی تقریر کو نمونے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔(۱)

۲۰۱۰م میں گجرات میں منعقدہ عالمی رابطۂ ادب اسلامی، شاخ برصغیر کے سہ روزہ اجلاس کے موقع پر عوامی اجلاس میں مولانا کی تقریر بھی بے مثال تھی۔ جامعہ علوم القرآن، جمبوسر کے وسیع وعریض میدان میں لگایا گیا پنڈال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج پر گجرات کے تقریباً تمام اساطین علم وفضل، ذمے داران مدارس اور شیوخ حدیث جلوہ افروز تھے۔ مولانا نے گفتگو شروع کی۔ طبقۂ علماء اور اہل دین میں پھیلی ہوئی بیماریوں کی طرف اشارہ کرنا شروع کیا۔ مجمع دم بہ خود اور مولانا پر جوش انداز میں محو گفتگو۔ اہل دین میں پائی جانے والی

(۱) اس تقریر کا تذکرہ خطابت کے ذیل میں صفحہ نمبر ۸۶ پر ہو چکا ہے۔ اجمل

اخلاقی بیماریوں اوران کے نتیجے میں مسلط ہونے والے دنیاوی واخروی عذاب کا تذکرہ، ایسی تڑپ کے ساتھ کیا کہ کئی معروف ومقتدر علماء بھی رونے لگے۔ مولانا نے نہ تو علماء وعام اہل دین کی ناراضی کی فکر کی اور نہ حلقے کے محدود ہونے کی۔ جو دیکھا اور سمجھا، اُسے صاف صاف بیان کردیا۔

مولانا کی بے باکی اور جرأت وہمت کی مثال کے طور پر ان کی متعدد تقریریں، تحریریں اور بے شمار واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اپنی بے باکی اور جرأت وہمت سے ان کو نہ تو کسی کی ہوا خیزی مقصود ہوئی تھی اور نہ کبھی بے اعتدالی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

(۴) جدید تقاضوں کا احساس

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی پشتینی ندوی تھے۔ ان سے اوپر کی تین پشتوں میں ایسے کئی افراد گزر چکے تھے، جو نہ صرف یہ کہ تحریک ندوہ سے وابستہ تھے، بل کہ اس تحریک کی توسیع وترقی میں مثالی کردارادا کرچکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے ہاں جدید تقاضوں کا احساس بڑی شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ دعوت واصلاح کے لیے جدید ترین وسائل اختیار کرنے کے بھی پرزور حامی تھے اوران وسائل کے لیے مناسب تدابیر کے مؤید بھی تھے۔ مثال کے طور پر موجودہ دور میں وہ مدارسِ دینیہ اور مکاتب کے ساتھ ساتھ اسلامی انگریزی اسکولوں کے قیام پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ اکیسویں صدی میں تشکیل پانے والے انسانی مزاج کا خیال رکھتے ہوئے اُن کا کہنا تھا کہ اعلیٰ معیار کے انگریزی اسکول کثرت کے ساتھ قائم کیے جائیں اوران میں اسلامی تعلیم وتربیت کا مضبوط نظام رکھا جائے۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ جہاں اس طرح کے معیاری اسکولوں کا قیام ممکن نہ ہو وہاں کم سے کم اس بات کی کوشش تو کرنی ہی چاہیے کہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم مستقل موضوع کی حیثیت سے دی جائے یا ان کی دینی تربیت کے لیے جزوقتی ادارے قائم کیے جائیں۔

اسی طرح وہ دعوت واصلاح کے لیے کسی مخصوص طریقے یا خالص دینی اجتماعات

کو ناکافی سمجھتے تھے۔ اسلامی موضوعات پر سمپوزیمس، ورک شاپس، کیمپس، دعوتی و اصلاحی مہموں اور ڈائیلاگس کو وہ ضروری بھی سمجھتے تھے اور مفید بھی۔ راقم سطور کے نام ۲۵ر صفر ۱۴۳۰ھ کو لکھے گئے ایک مفصل خط میں وہ لکھتے ہیں:

''ورک شاپ کی کامیابی سے خوشی ہوئی۔ اس کا پورا نقشہ بنا کر سال میں مختلف موقعوں پر ہونے رہنا چاہیے۔ جن میں بنیادی چیزیں ذہن نشین کرائی جائیں اور یہ مختلف موضوعات پر ہوں۔ بنیادی دینی تعلیمات، عبادات اور ان کے صحیح طریقے، گھریلو زندگی میں عورت کا کردار، بچوں کی تربیت میں خواتین کا حصہ، ذہنی، اخلاقی اور جسمانی طور پر وغیرہ، ہر ایک موضوع پر الگ ورک شاپ ہونا چاہیے۔

رہبر انسانیت مہم کا انعقاد مبارک ہے۔ اس کو جتنا فائدے مند، نتیجہ خیز اور شکوک و شبہات کے ازالے کا ذریعہ بنایا جاسکے، دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت اس کی سخت ضرورت ہے۔ یہ حضرت سرکار دو عالم ﷺ کا ادنیٰ حق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس خدمت کے لیے قبول فرمالے۔ آمین

خاص طور سے ہندی، انگریزی میں یہ کام جتنا زیادہ ہو، بہتر اور مفید ہوگا۔''

ان جملوں سے یہ اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے کہ مولانا دعوت و اصلاح کے لیے زمانے کی ضرورتوں اور مزاج و طبیعت کا خیال رکھنے کو ضروری سمجھتے تھے۔ تمام رائج طریقوں کو دعوتِ اسلام کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے اور کسی بندھے ٹکے طریقے پر اصرار کرنے کو دعوت و اصلاح کے لیے مضر سمجھتے تھے۔

(۵) مرکز سے وابستگی

مولانا عبداللہ حسنی کا ایک انتہائی اہم اور قابل تقلید وصف یہ بھی تھا کہ انھوں نے آخری دم تک اپنے فکری مرکز اور اس کے ذمے داران سے کامل وابستگی رکھی۔ اپنی الگ تنظیم، جماعت یا ادارہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی رہ نمائی اور سرپرستی میں ملک بھر میں بیسیوں ادارے قائم ہوئے، لیکن انھوں نے ان سب کو ندوے کی شاخ بنوایا۔ کوئی الگ نظام مدارس قائم نہیں کیا۔ غیر مسلموں میں دعوتی کام کا مضبوط اور وسیع

نیٹ ورک پھیلایا تو وہ بھی پیام انسانیت کے جھنڈے تلے۔ ہاں، ضرورتاً نومسلموں کی تربیت وغیرہ کے لیے ایک ادارہ ضرور قائم کیا۔لیکن وہ بھی اپنے بڑوں سے مشورے کے بعد اوران ہی کی سرپرستی میں۔

لوگ کچھ نہ ہوکر بھی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد تعمیر کرنے لگتے ہیں۔لیکن مولانا نے بہت کچھ ہوکر بھی اپنے مرکز سے کامل وابستگی اور اپنے بڑوں کی مکمل رہ نمائی ہمیشہ باقی رکھی۔جو کچھ بھی کیا بڑوں کے مشورے اوران کی رہ نمائی میں کیا۔معمولی سا قدم بھی ان کی مرضی کے بغیر یا ندوے کی مصلحت کے خلاف نہیں اٹھایا۔یہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا مثالی اور روشن وصف ہے جو ہر شخص بالخصوص ہر عالم دین کے اندر ہونا چاہیے۔

باب دوم

داعی اسلام

مشاہیر امت اور معاصرین کی نظر میں

روشِ دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے
یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک مرا افسانہ ہے

جگر مرادآبادی

داعی اسلام مولانا سیّد عبداللہ حسنی ندوی کی وفات کے حادثۂ جاں کاہ پر ہر شخص تڑپ کر رہ گیا۔ خاص طور پر ملت اسلامیہ ہندیہ کے علمی و دینی حلقوں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ سے کوئی بیش قیمت ہیرا اچانک چھین لیا گیا۔ ملک و بیرون ملک میں کثرت سے تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے، اخبارات میں مضامین شائع ہوئے اور رسائل و جرائد نے خصوصی شمارے اور گوشے شائع کیے۔ دوسری طرف دنیا بھر سے سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں نے مولانا مرحوم کے مربی، چچا اور خسر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، چھوٹے چچا مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی اور برادر خُرد و جانشین مولانا سید بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی کو خطوط لکھ کر اظہار تعزیت کیا۔ خطوط لکھنے والوں میں علماء کرام بھی تھے اور مشائخ عظام بھی۔ جماعتوں اور تنظیموں کے ذمے داران بھی تھے اور سربراہان مملکت بھی۔ ان خطوط کو جمع کیا جائے تو بہ آسانی ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ یہاں ان خطوط اور اہم مضامین کے کچھ اقتباسات دیے جا رہے ہیں۔ تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ امت کے ہر طبقے کی نظر میں مولانا علیہ الرحمۃ کا کیا مقام تھا۔ ابتداء میں بیسوی صدی کی دو عظیم مرحوم شخصیات کا ایک ایک جملہ بھی بہ طور تبرک شامل کر لیا گیا ہے۔

(اجمل)

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کو خلافت عطا کرنے کے بعد بڑے انشراح سے فرمایا تھا:

''ہم نے عبداللہ کو اجازت (بیعت وارشاد) دی ہے اور وہ اس کے اہل ہیں۔''

○

کاروان تھانوی کے آخری مسافر، محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق حقی ہردوئی کے ایک مرید نے خط لکھ کر سوال کیا کہ کیا وہ تزکیہ و اصلاح کے معاملات میں مولانا سیّد عبداللہ حسنی ندوی سے رجوع کر سکتا ہے؟ تو محی السنۃ نے پورے اعتماد کے ساتھ ارشاد فرمایا:

''آپ کو بہ خوشی اجازت ہے کہ اصلاحی مکاتبت مولانا عبداللہ حسنی دامت برکاتہم سے جاری کر لیں۔''

○

برادرزادۂ عزیز عزیز القدر مولوی سیّد عبداللہ حسنی ندوی مرحوم حسنی خاندان کی اُس شاخ سے ہیں، جو کئی پشتوں سے علم دین کی خدمت کا امتیاز رکھتی ہے۔ ان کے والد مولانا سیّد محمد الحسنی عربی اور اردو دونوں زبانوں کے ذریعے صحیح فکر اسلامی کی صرف ترجمانی ہی نہیں کرتے تھے بل کہ اس کی اشاعت اور اسلام دشمن فکر کا مقابلہ مؤثر اسلوب میں کرتے تھے اور عربی ماہ نامے اور اردو پندرہ روزہ پرچے کی ایڈیٹری بھی کرتے تھے۔ عمر انھوں نے کم پائی لیکن اس کم عمری میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے اپنے چچا حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مفکرانہ اور داعیانہ جدوجہد کے طرز کو اختیار کیا تھا اور ان کے صحیح جانشین بننے کے لائق ہو گئے تھے۔ لیکن مقدر میں ان سے پہلے جانا تھا۔ اپنے دائرۂ عمل میں وہ جو کر سکتے تھے انھوں نے کیا۔

مولوی سیّد عبداللہ حسنی نے ان ہی کے راستے کو اختیار کیا اور اپنے والد کے چچا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی صحبت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور تزکیہ اور خدمتِ دعوت دونوں میں ان کے طریقے کو اختیار کیا تھا۔ خاص طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ''پیام انسانیت'' کے عنوان سے غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کا جو حکیمانہ طریقہ اختیار کیا تھا، اُس کو انھوں نے اُن کی وفات کے بعد آگے بڑھایا اور اس سلسلے میں بڑی خدمت انجام دی اور تھوڑی مدت میں اچھے رفقاء تیار کر دیے، جنھوں نے مختلف حصوں میں کام کو پھیلایا۔

عزیز مرحوم نے زندگی کی ۵۶ بہاریں دیکھیں اور اس میں اُن کو اپنے پردادا مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) سے مناسبت رہی کہ انھوں نے بھی تقریباً اسی عمر میں دنیا سے رحلت کی تھی۔ وہ اپنے محبین اور قدر دانوں کو رنجیدہ چھوڑ گئے۔ لیکن وہ ایک دعوت اور مشن بھی چھوڑ کر گئے ہیں، جو اُن کا سرمایۂ حیات تھا۔ اس لیے ان کی وفات کا اثر ملک اور بیرون ملک میں محسوس کیا گیا اور ملک و بیرون کے دعوتی ذہن رکھنے والوں نے

خاص طور پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔ اس طرح وہ داعیانہ عمل کی سوغات لے کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

○

برادرم شیخ عبداللہ حسنی ندوی کے انتقال پر ملال کی خبر سے بڑا رنج ہوا۔ مرحوم دعوت اسلامی کے اہم رکن تھے اور اس میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہے تھے۔ آپ کی وفات سے صرف ہندستانی مسلمانوں ہی کا نقصان نہیں ہوا، بل کہ یہ پوری امت مسلمہ کا خسارہ ہے۔ آپ کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا سوائے اللہ کی توفیق کے ممکن نہیں۔ آپ کی شخصیت علم وعمل کا بہترین نمونہ تھی۔

ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ امت محمدیہ کو مرحوم کا نعم البدل عطا فرمائے، جو آپ کے کاموں کو بہ حسن وخوبی انجام تک پہنچائے اور اخلاص کے ساتھ دعوت الی اللہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ اللہ کے دین کی نصرت وحمایت کو اپنا مقصد بنائے اور دین اسلام کے تعلق سے پیدا کیے جانے والے شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے سینہ سپر ہو جائے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے اور اس کی دعوت روئے زمین کی ہر دعوت پر غالب آ جائے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی وسیع رحمتوں کی چادر میں ڈھانپ لے اور انبیاء وصدیقین، شہداء وصالحین میں آپ کو شامل فرمائے، بے شک اللہ تعالیٰ ہی ان کا بہترین رفیق ہے۔

شیخ احمد بن حمد خلیلی

(مفتی عمان)

○

حضرت علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے وصال کے بعد تحریک پیام انسانیت

کے جانشین جناب مولانا سید عبداللہ حسنی صاحب ندوی ہوئے۔ انھوں نے حضرت علامہ کو اس کام میں فنائیت کا جذبہ رکھتے ہوئے اور اس کو ہر مصروفیت پر مقدم رکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پیام انسانیت کے جلسوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ حضرت علامہ کے آخری ایامِ حیات با سعادت میں برابر اس میں شریک رہ کر اس کی سربراہی اور وقت کے حالات کو پیش نظر رکھ کر کام کرنے کا سلیقہ من جانب اللہ ان کو حاصل ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی اس کام کو اپنے جد عظیم کی دینی وراثت سمجھ کر کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور سفر خواہ کتنا ہی طویل اور با مشقت ہو، وہ اس پیغام کو پہنچانے کے لیے اپنے رفقاء کے ساتھ نکلتے اور جہاں بھی ضرورت محسوس کرتے تقریر کے ذریعے اور باہمی مجلس و گفتگو کے ذریعے اپنے اس پیغام کو مؤثر طریقے سے پہنچاتے۔ اس دینی اور دعوتی وراثت کو اپنانے بل کہ اس کو سینے سے لگا لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ذریعے ایک معتد بہ تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی اور بہت سے غیر مسلم خاندان بہ حیثیت کل زندگی کی صحیح راہ پاتے گئے۔

مولانا عبداللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے علم و دعوت کی جامعیت حاصل کی اور اس راہ میں اپنے آپ کو فنائیت کے درجے تک پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس عمل کو جس کی بنیاد اخلاص کامل پر تھی، قبول کر لیا اور بے شمار انسانوں کو ان سے راہِ حق کی تعلیم حاصل ہوئی اور اسلام کا صحیح پیغام ان تک پہنچا۔ وہ اپنے عمل سے سرخرو ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق ایک قابل تقلید زندگی کی بنیاد مضبوط کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو گئے اور نہایت مطمئن و پرسکون حالات کے ساتھ راضی بہ رضا اپنے رب کے دربار میں پہنچ گئے۔ جہاں اُن کے لیے با سعادت اور کام یاب لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل ہونے کا فرمان الٰہی حاصل ہوا ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اُس محبوب ہستی کی روح پر، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ وہ زبان حال سے کہہ رہے ہوں:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
(مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء و مدیر البعث الاسلامی لکھنؤ)

○

عزیزی عبداللہ حسنی ندوی، جنھیں اب مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے، ہمارے محبوب رفیق اور ماموں زاد بھائی محمد الحسنی کے صاحب زادے تھے اور ہمارے مربی اور مشفق ماموں ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے محبوب پوتے تھے۔ اس لیے وہ اولاد ہی کی طرح تھے اور صلاح و تقویٰ اور دینی جذبات کی وجہ سے قابل قدر، محبت اور ہم دردی کے لائق تھے۔ انھوں نے علمی و تدریسی صلاحیت اور مقبولیت کے ساتھ دعوت، اصلاح معاشرہ، احقاق حق اور انسانی خدمت کا میدان اختیار کیا اور اپنے دادا اور ان کے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی فکر اور طرز عمل کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ وہ حدیث شریف سے شغف رکھنے کی وجہ سے سیرت کو اپنے لیے نمونہ اور ذات رسول ﷺ کو اپنے لیے اسوہ سمجھتے تھے۔ اتباع سنت کا ان کو بڑا اہتمام تھا اور وہ اپنے معتقدین کو بھی اس کی پابندی کا حکم دیتے تھے۔ سخت بیماری میں بھی وہ اس پر عامل تھے۔

مولانا یوسف صاحب کاندھلوی کے بارے میں ایک بزرگ کا قول ہے کہ وہ اپنے عصر میں اپنے بڑوں سے بڑھ گئے تھے۔ یہ بات مولوی عبداللہ حسنی ندوی مرحوم کی زندگی کی جامعیت، مقبولیت اور توفیق الٰہی کو دیکھ کر کہی جاسکتی ہے۔ فجزاہ اللہ خیراً بما ھو أھلہ۔

اُن کی بے چینی اور فکر و عمل کو دیکھ کر بعض وقت محسوس ہوتا تھا کہ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ مدت عمل کم ہے۔ وہ چلے گئے، لیکن اپنے مشن کو چلانے اور جاری رکھنے کے لیے ایسے افراد چھوڑ گئے، جو ان شاء اللہ ان کے نہج پر کام کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔

ان کے انتقال کا صدمہ فطری ہے، لیکن ذلک قضاء اللہ ونحن بقضاء اللہ وقدرہ راضون۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

(معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

○

آج ہی مولوی عبداللہ حسنی ندوی کے سانحۂ انتقال کی اچانک خبر دل پر بجلی بن کر گری۔ یہ تو علم تھا کہ بیمار ہیں مگر اس کا احساس نہ تھا کہ مرض نے شدت اختیار کرلی۔ آپ سب کے لیے تو ظاہر ہے کہ یہ حادثہ کئی نسبتوں سے بہت سخت ہے۔ مگر جو لوگ ان سے قریب رہے ہیں، ان کے لیے بھی یہ خبر سخت ہے۔

میں مولوی عبداللہ مرحوم کی صلاحیتوں کا ایک زمانے سے قائل رہا ہوں۔ بہت عرصہ ہوا میری پہلی ملاقات مولوی عبداللہ مرحوم سے حضرت مولانا علی میاںؒ کے ساتھ دوحہ، قطر میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے ہی میں ان سے متاثر تھا۔ موت تو برحق ہے، صبر و رضا کا مقام بھی ہے۔ حادثۂ انتقال اور عمر بھر کی محرومی تو اپنی جگہ اس سے زیادہ افسوس و ماتم اس سے ہوتا ہے کہ جو علم ان کے سینے میں تھا اور جن صلاحیتوں کے وہ مالک تھے ان سے ہمیشہ کی محرومی اور بھی سخت حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ محروم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی

(صاحب زادۂ گرامی علامہ سید سلیمان ندوی، ساؤتھ افریقہ)

○

مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی اپنے خاندان کی شرافت کا نمونہ اور علم و معرفت کے حقیقی وارث تھے۔ اگرچہ اس حقیر کو سیدی و سندی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صحبت سے زیادہ استفادے کا موقع نہیں ملا، لیکن ایک دو بار رائے بریلی میں حاضری کا اور کئی بار لکھنؤ میں ملاقات کی سعادت حاصل رہی اور متعدد مواقع پر محسوس ہوا کہ مولانا

محمد الحسنی کی وفات کے بعد مولانا عبداللہ حسنی صاحب مولانا کی توجہات اور ان کی شفقتوں کا مرکز بن چکے ہیں اور اپنے خاندان کی اگلی پشت میں مولانا کی سب سے زیادہ نگاہ ان ہی پر ہے۔اس میں دادا کی شفقت ومحبت کے ساتھ ساتھ خود مولانا عبداللہ صاحب کے جوہر قابل، سعادت مندی، تواضع، شرافت نفسی اور جذبۂ فنائیت کا دخل تھا۔تعلق مع اللہ اور تزکیۂ نفس میں بھی وہ اپنی خاندانی روایت کے بہترین وارث تھے اور ملک کے کونے کونے میں ان کے منتسبین موجود تھے، جو مولانا عبداللہ حسنی کے ذریعے اپنے ایمان اور تقویٰ کی انگیٹھیاں گرم کرتے تھے اور احسان کی منزلوں کو طے کرتے تھے۔

مولانا کا سب سے بڑا کام بل کہ کارنامہ ''تحریک پیام انسانیت'' ہے۔اس تحریک کی بنیاد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے رکھی تھی۔ان کی نظر میں اس تحریک کی منزل اسلام کی دعوت تھی۔مولانا علی میاں صاحب کی وفات کے بعد مولانا عبداللہ حسنی صاحب نے اس تحریک کو نہ صرف اپنے ہاتھ میں لیا بل کہ اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیا اور اس کے ذریعے پورے ملک میں برادران وطن تک دعوت اسلام کو پہنچانے کی بہترین کوششیں فروغ پانے لگیں۔سیکڑوں لوگوں کو آپ کے ذریعے بہ راہ راست یا بالواسطہ ہدایت حاصل ہوئی اور وہ اسلام کے حلقہ بہ گوش ہوئے۔غیر مسلموں کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ان کے دادا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی غیر مسلم بھائیوں میں دعوت کے کام کے آرزومند تھے اور اپنے برادر خُرد کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔مولانا عبداللہ حسنی صاحب گویا اسی خواب کی تعبیر اور اسی آرزو کی تکمیل تھے۔

اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اس کام کو بغیر کسی تشہیر کے انجام دیا، جو اس کی حکمت ومصلحت کا تقاضا ہے۔اگر وہ چاہتے تو اپنے اس دعوتی کام کو کسی نئی تحریک سے موسوم کر سکتے تھے، جس سے ان کا تشخص قائم ہوتا اور وہ ان کی طرف منسوب ہوتا۔مگر ان کے تواضع اور کسر نفسی کی بات ہے کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔بل کہ ''پیام انسانیت'' کے نام

سے جو تحریک پہلے سے قائم تھی، اسی کے زیر سایہ یہ خدمت انجام دی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

(سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

○

امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے قبل ان کی عیادت کرنے والوں کا اتنا بڑا مجمع ہو جاتا تھا کہ شہر میں چلنا پھرنا، زندگی گزارنا مشکل تھا۔ چناں چہ حکومت وقت کو کرفیو لگا کر شہر میں آنے والوں پر پابندی لگانا پڑی اور جب ان کی وفات ہوئی تو پورا شہر جنازے میں شامل ہو گیا۔ ایسا کہ جامع مسجد میں جماعت تک نہ ہو سکی۔ کم و بیش یہی صورت حال درجہ بہ درجہ بہت سے بزرگوں کی وفات کے وقت پیش آئی۔ حال ہی میں قریبی دو بزرگوں (حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب باندوی، حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی) کے جنازوں کا ایسا ہی منظر پیش آیا۔ اس کے دیکھنے والے ہزاروں اب بھی موجود ہوں گے کہ بسوں، موٹروں، دیگر سواریوں اور پیدل چلنے والوں کا ایسا ہجوم تھا کہ گھنٹوں راستے بند رہے۔ حال ہی میں ایک بار پھر تقریباً ایسا ہی منظر دیکھنے کو دار العلوم ندوۃ العلماء اور تکیہ کلاں رائے بریلی دونوں میں نظر آیا۔ اگرچہ مؤخر الذکر سن و سال کے لحاظ سے مقدم الذکر حضرات کے ہم سن تو کیا، اُن کی اولاد و احفاد سے بھی چھوٹے تھے، مگر مقبولیت و مرجعیت میں اپنے بہت سے پیش رووں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ کیا خوب کہا گیا ہے:

ع: بزرگی بہ فضل است نہ بہ سال

(بزرگی علم و فضل کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ عمر اور سال کی وجہ سے)

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

(شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء و نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

○

حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی کو سالہا سال اپنے دادا (یعنی برادر دادا) مفکر اسلام، زاہد بے مثال حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔

کئی ایک خوبیاں (کہ جن میں کی فقط ایک دو خوبیوں سے آدمی کافی بڑا معلوم ہوتا ہے) اس سرائے میں ساتھ لائے تھے اور مزید برآں اُن کی مقناطیسی اور جذابی فطرت نے والد و دادا سے بھی بہت کچھ جذب کیا، جس کی شہادت اُن کی پوری زندگی دیتی ہے۔

تاحین حیات ان کا اشہب قلم مختلف موضوعات پر سرپٹ دوڑتا رہا۔ مشہور رسالے 'الرائد' کے توسط سے پُر جوش مگر اخلاص و ہم دردی سے بھرپور طریقے سے عربوں اور وابستگان الرائد کو جھنجھوڑتے رہے۔ اپنا درد دل اور امت کی زبوں حالی انڈیلتے رہے اور ان کے علاج و معالجات کے نسخے بیان کرتے رہے۔ بہ ہر کیف! ۳۰ رجنوری ۲۰۱۳م کو صبح ساڑھے دس بجے علمی و دعوتی دنیا کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

مولانا مفتی احمد خان پوری

(شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات)

○

کل مؤرخہ ۳۰ رجنوری ۲۰۱۳م کی شام حضرت مولانا عبداللہ حسنی علیہ الرحمۃ کے انتقال پرملال کی خبر وحشت اثر ملی۔ إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔

''کل من علیھا فان'' کا قانون اٹل ہے۔

حضرت مولانا عبداللہ حسنی سے ایک یادگار ملاقات کی سعادت فقیر کو دیار حرم میں نصیب ہوئی۔ مرحوم نے جس محبت و الفت و مسرت و گرم جوشی کا اظہار اس فقیر سے کیا، اُس کی مٹھاس آج بھی دل میں موجود ہے۔ یہ الفاظ صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے مرحوم کا مسکراتا ہوا چہرہ آنکھوں کو پرنم اور دل کو پرغم کر رہا ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں ایک علمی و عملی شخصیت، داعی إلی اللہ کا عالم جوانی میں داغ مفارقت دے جانا ہم فقیروں کے لیے سانحہ فاجعہ کی مانند ہے۔

اللہ رب العزت مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ اپنے قرب کے اعلیٰ ترین درجات عطا فرمائے اور ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے۔ بہ قول شخصے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہ بانی کرے

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

(پاکستان)

○

یہ خبر سن کر بہت رنج ہوا کہ آپ کے داماد، جید عالم دین، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مدرس اور حضرت مولانا علی میاں ندوی کے خلیفہ، معروف مبلغ ومقرر مولانا عبداللہ حسنی ندوی صاحب اس دارفانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بلاشبہ مولانا کا انتقال ندوۃ العلماء اور ملت اسلامیہ کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مولانا کا شمار ندوۃ العلماء کے معروف مبلغین میں ہوتا ہے۔ دینی ودعوتی سرگرمیوں میں مولانا کا ایک مقام تھا۔ مرحوم ندوۃ العلماء سے نکلنے والے عربی جریدے 'الرائد' کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ ہندستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی بہت مقبول ہے۔

مولانا عبداللہ حسنی ندوی کے انتقال پر میں دلی رنج کا اظہار کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

محمد حامد انصاری

(نائب صدر جمہوریہ ہندو سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ)

○

موصوف طویل عرصے سے ندوے میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، اس کے علاوہ دینی و اصلاحی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ خاص طور سے غیر مسلموں میں تبلیغ دین کے کاموں سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے

کہ وہ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے، انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مولانا سید جلال الدین عمری

(امیر جماعت اسلامی ہند)

○

مرحوم مولانا عبداللہ الحسنی الندوی کا اچانک انتقال میرے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔ ان سے ملت کو بہت توقعات وابستہ تھیں۔ اس قحط الرجال کے زمانے میں ان کی رحلت ایک بڑا خلا تحریک ندوۃ العلماء اور ملت اسلامیہ کے لیے چھوڑ گئی ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

(بانی مدیر ہفت روزہ ملی گزٹ وصدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت)

○

مولانا عبداللہ حسنی نے ساری عمر (ماشاء اللہ) ہوش سنبھالنے سے لے کر دنیا سے رخصت ہونے تک اپنی تمام صلاحیتیں، سارا وقت، ساری توانائی اور جو کچھ خداداد چیزیں تھیں، سب اللہ کے بندوں کو نفع پہنچانے میں، حضور پاک ﷺ کے غم کو اپنا غم بنانے میں اور آپ کی تعلیمات کو رواج دینے ہی میں استعمال کیں۔ ہم تو آپ کے نمک خوار بھی ہیں اور خوشہ چیں بھی ہیں۔ ہم بہت ناقدرے ہوئے۔ ہم نے حضرت کو بھی نہیں پہچانا۔ آپ کی کوئی قدر ہم سے نہیں ہوئی۔ اللہ جل شانہ حضرت مولانا کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمادے اور پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔

مولانا احمد لاٹ ندوی

(رہنما جماعت تبلیغ، نظام الدین، دہلی)

○

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نے مختلف جہات سے دین کی خدمت انجام دی۔

انھوں نے برسوں قرآن مجید اور بخاری شریف جیسی اہم کتابوں کا درس دیا۔ ان کا خاص میدان غیروں میں دعوت وتبلیغ تھا۔ انھوں نے دین کا پیغام غیروں تک پہنچایا اور پھیلایا اور ہزاروں کو ضلالت وگم راہی کے گڑھے سے نکالا۔ انھوں نے اس کام کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ کر کیا اور وہ اس میں بڑے کام یاب ثابت ہوئے۔ تصوف کی جہت سے بھی انھوں نے خدمت کی اور تزکیۂ نفس کا عظیم کام بھی کیا۔ حضرت مولانا علی میاں کی رحلت کے بعد انھوں نے اس ذمے داری کو بہ حسن وخوبی نبھایا۔ حضرت مولانا کی جاری کردہ تحریک پیام انسانیت کے وہ سرپرست وعلم بردار تھے۔ ان کے وصال سے ملت کا مضبوط ترجمان اور نمائندہ اٹھ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت کی کیاریوں میں رکھے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

مولانا سید محمد ولی رحمانی

(سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

○

حادثۂ فاجعہ کی خبر سے ہم سب لوگ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ خود آپ پر کیا گزری ہوگی، اس سے حق تعالیٰ واقف ہیں۔

ع قربانی راپیش بود حیرانی

حق آپ سب حضرات پر اپنی رحمتیں اور بے پایاں سکینہ نازل فرمائے اور اجر جزیل کی دولت عطا فرمائے۔

مولانا محمد سلمان مظاہری

(ناظم مدرسہ مظاہر العلوم، سہارن پور)

○

مولانا موصوف اس دور میں اپنے اسلاف واکابر بالخصوص مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے افکار واقدار کے علم بردار تھے۔ دعوت الی اللہ کے

میدان میں مولانا کی خدمات کے گہرے نقوش کو ملت اسلامیہ دیر تک اور دور تک یاد رکھے گی۔ مولانا سنجیدگی و متانت کا دل نواز پیکر تھے۔ ہر بات میں سنت نبوی پیش نظر رہتی تھی۔ آپ نبوی اخلاق کا نمونہ تھے۔ ایک داعی کو جن صفات کا حامل ہونا چاہیے، مولانا ان خوبیوں سے مالا مال تھے۔ علوم معارف کی دولت سے مالا مال ہونے اور شہرت کی بلندیوں پر فائز ہونے کے باوجود گم نامی اور عزلت پسند کرتے تھے۔ تواضع، خاکساری اور ایثار پسندی آپ کی شخصیت کے گراں مایہ جواہر تھے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو مولانا کی ذات اور علم پر اعتماد تھا۔ آپ نے بہت سے مواقع پر حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی نیابت اور نمائندگی کے فرائض کو بہ حسن وخوبی انجام دے کر حضرت مولانا کی قلبی دعائیں اور توجہات حاصل کیں۔

مولانا موصوف غیر مسلموں میں دعوت کا فن اور ہنر جانتے تھے۔ اسی گن اور ہنر کا نتیجہ تھا کہ بے شمار افراد کو مولانا کے ہاتھ پر قبول اسلام کی توفیق ملی۔

مولانا محمد سعیدی

(ناظم ومتولی مدرسہ مظاہر العلوم وقف، سہارن پور)

○

حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کے سانحۂ ارتحال کی غیر متوقع خبر سے سخت صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ بڑے بے لوث اور مخلص انسان تھے۔ قوم وملت کی بڑی گراں قدر خدمت انجام دے رہے تھے اور پریشان حال ملت کے لیے امید کی کرن تھے۔ ان کی اچانک وفات ”خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود“ کے مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کے سچے اور خاموش خادم کی خدمت کو قبول فرمائے اور انہیں شہداء اور صدیقین کے زمرے میں شامل کرے۔

مولانا سرفراز احمد اصلاحی

(صدر مدرس مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ)

○

یہ خبر سن کر بہت رنج ہوا۔ اس وقت قلم اور ذہن کو یارا نہیں کہ کس طرح ہم تعزیت کا اظہار کریں۔ مولانا سید عبداللہ حسنی کے حادثۂ رحلت نے دارالمصنفین کو پوری طرح سوگ وار کردیا ہے۔ ان کی علالت کی خبریں ملتی تھیں لیکن یہ حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح رخصت ہو جائیں گے۔ ایسے وقت جب کہ امت کو ان کی ضرورت تھی، مستقبل میں ملت کی رہ نمائی کے لیے نگاہیں ان ہی پر تھیں۔ ایسے عالم، متقی اور امت کے مسائل کے لیے فکر مند اور درد مند اور حل مشکلات کے لیے مسلسل محنت، عملی جہاد کی زندگی گزارنے والے کا جانا ہم سب کے لیے یقیناً جاں کاہ حادثہ ہے۔ پوری امت تعزیت کی مستحق ہے، لیکن آپ کا غم ظاہر ہے اس سے بھی سوا ہے۔ ہمارے پاس الفاظ ہی نہیں کہ غم گساری کیسے کی جائے اور پھر آں جناب کے سامنے جن کی شخصیت خدا جانے کتنوں کے لیے باعث تسکین بنتی رہی، صبر و رضا کے جس مقام پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور پورے خانوادۂ حسنی کو فائز کیا ہے، وہ ہم سب کے لیے تقلید کے لائق ہے۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
(صدر دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

○

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا شمار اس دور کی مغتنم شخصیات میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی کم عمری کے باوجود ہندستان کے اکابر کے نزدیک نہایت محترم اور معتمد علیہ تھے۔ وہ ایک معتبر عالم دین تھے۔ سادگی و تواضع، اخلاق حسنہ، اخلاص وللّٰہیت جیسے اوصاف کے حامل تھے۔ ساتھ ہی وہ ایک انشاء پرداز صاحب قلم اور کام یاب مدرس بھی تھے۔ اُن کی وفات سے امت کے ہر طبقے کو بڑا نقصان پہنچا۔ مدارس دینیہ کے خادمین کو مولانا سے ہمیشہ تعلیمی و تربیتی امور میں مفید مشورے ملتے رہتے تھے۔ احقر نے اس سلسلے میں ایک سے زائد مرتبہ مولانا سے مشورہ کیا۔ مولانا کی عیادت کے دوران اُن کی قیام گاہ پر ایک معاملے میں

مشورہ کیا، جس کے بڑے مفید نتائج ثابت ہوئے۔ بالخصوص تبلیغ و دعوت اور اشاعت دین کا کام کرنے والوں کو اُن کے مشوروں، ملفوظات اور خود ان کے ایمان و یقین، اولوالعزمی و جفاکشی، صبر و ثبات اور روحانی سوز و گداز سے فیض پہنچتا تھا۔ ان کی کوششوں سے جہاں علم دین کے خادمین کی ایک مخلص جماعت تیار ہوئی، وہیں دعوت و تبلیغ کے میدان کو مخلص افراد کار ملے۔

اُن کی رحلت سے رشد و ہدایت، تبلیغ و دعوت اور اشاعت اسلام کے میدانوں میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ اللہ مولانا کے کاموں کو جاری و ساری فرمائے اور ہم خادمین کو اس میں حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائے۔

مصائب اور تھے پر اُن کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

مولانا قاری حبیب احمد باندوی
(ناظم جامعہ عربیہ، ہتھورا، باندہ)

○

مولانا عبداللہ حسنی صاحب کے والد مرحوم مولانا سید محمد الحسنی میرے رفیق درس رہے ہیں۔ اُن کی بڑی خواہش تھی کہ میرا بچہ تعلیمی مراحل طے کر کے محدث اور داعی بنے۔ مولانا مرحوم میں یہ دونوں صفت پیدا ہو گئی تھیں۔ ندوہ میں حدیث شریف کا درس دینے لگے تھے۔ وہ جلسوں میں ایک اچھے واعظ و مقرر کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آئے۔ ذکر و فکر و انابت الی اللہ کی دولت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سرفراز کیا تھا۔ اس لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کو اجازت و خلافت کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ ان کی تبلیغی و دعوتی حکمت عملی سے بڑی تعداد میں لوگ حلقہ بہ گوش اسلام ہو رہے تھے۔ اس میں ان کو انفرادی حیثیت حاصل تھی۔

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری
(پروفیسر حدیث العین یونی ورسٹی، یو اے ای)

○

منتسبین ندوۃ العلماء، وابستگان تحریکات فکر ودعوت، طالبان علوم نبوت، رہ روان شریعت وسنت اور سالکان تصوف وطریقت کو ایک اور تازہ الم انگیز صدمہ پہنچا۔ یعنی مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی پس ماندگان کو یہ کہتا چھوڑ کر عالم فانی سے ملک بقاء کی طرف راہی ہوگئے کہ "خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود۔" اس حادثۂ فاجعہ کی خبر آناً فاناً پوری دنیا میں پھیل گئی اور ایک عالم کو سوگ وار کرگئی۔ اس دور میں جب کہ باکمال افراد اور رجال الفکر والدعوۃ کا وجود عنقاء ہے، آپ کا وجود مغتنمات میں سے تھا۔ مادہ پرستی اور علمی اور روحانی زوال کے عہد میں آپ ہمہ جہت سے آنکھیں بند کرکے درس وتدریس، دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت اور ارشاد وتلقین کے کام میں مشغول تھے۔

مولانا مرحوم غایت ادراک ونہایت فہم سے متصف، فنون ادبیہ وعلوم نقلیہ کے جامع، فروع واصول پر حاوی، مالک مشاہدہ وصاحب مطالعہ تھے۔ علم تفسیر وحدیث نہایت متحضر تھا۔ عام طور سے حدیث وتفسیر کی کتابوں کا درس دیتے۔ فقہ سے بھی اچھی خاصی مناسبت تھی۔ طلبہ آپ سے مطمئن ہی نہیں بل کہ آپ کے طرز تدریس، مسائل کی تقریر اور معضلات وغوامض کی تشریح کے دل دادہ تھے۔ تقریر کرتے تو ہمیشہ شریعت وسنت کے مطابق۔ بلند پایہ خیالات انتہائی سادگی، نفاست اور دل کشی سے ادا کرتے۔ گفتگو قرآنی آیات اور احادیث سے مدلل ہوتی۔ بزرگوں کے واقعات اور سلف کے احوال اس طرح سناتے کہ سامعین کی دل چسپی میں اضافہ ہوجاتا۔ صحت کی خرابی، جسمانی تکالیف اور نامساعد حالات کے باوجود پوری زندگی درس وتدریس، ارشاد وتلقین اور اعلائے کلمۃ الحق میں گزار دی اور یہ کہتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کردی:

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی
(آکسفورڈ یونی ورسٹی، لندن، انگلینڈ)

○

مولانا سیّد عبداللہ حسنی ندوی خانوادۂ علم الٰہی سے نسبت رکھنے والے اُن سیکڑوں افراد میں سے ایک تھے، جو صبر و قناعت، خلوت پسندی اور اخفائے حال کی صفت سے متصف ہوا کرتے تھے۔ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پوتے ہی نہیں، شاگرد اور دست گرفتہ و مجاز بیعت بھی تھے۔ مولانا کی صحبت و معیت میں رہ کر اور مولانا سے تربیت پاکر وہ کندن بن گئے تھے۔ وہ بالیقین خانوادۂ علم الٰہی کی متاع گراں مایہ تھے۔ عالی نسب ہی نہیں، عالی حوصلہ بھی تھے اور خاندانی روایات کے امین و پاس دار بھی۔ انھوں نے خاندان کے ممتاز ترین بزرگ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے صرف انس و محبت کی سوغات ہی نہیں، مزاج و عادات، علو ہمت اور دنیا سے بے رغبتی و یک سوئی کی دولت بھی پائی تھی۔ صوفیانہ مزاج و انداز اور خدا ترسی کا جذبہ ورثے میں پایا تھا۔

مولانا مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں دین کی دعوت جس ہمت اور لگن کے ساتھ دی اور اس کے لیے جتنی مشقتیں اٹھائیں اور اپنے مقصود کو پانے کے لیے اُن کے دل میں جو اضطراب تھا، اُس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے وہی کیا، جو اُن کے اسلاف صدیوں سے کرتے چلے آئے تھے۔ اللہ کے فضل سے ان کی مساعی بار آور ہوئیں اور بندگانِ الٰہی جوق در جوق ان کی طرف رجوع ہوئے اور اللہ والے بن گئے۔

ہمارے پیشوا و مقتدا مولانا سید عبداللہ صاحب حسنی علیہ الرحمۃ تو خوشی خوشی راہِ وفا سے گزر گئے۔ اب بعد والوں کو ان ہی نقوشِ قدم پر چلنے اور ان ہی خطوط پر کام کرنے کی ضرورت ہے، جو مولانا چھوڑ گئے ہیں۔ شاعر نے کیا اچھی بات کہی ہے:

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

مولانا عزیز الحسن صدیقی

(مہتمم مدرسہ دینیہ، غازی پور، یوپی)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی خصوصیات کے مولانا عبداللہ حسنی امین و وارث تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس و تدریس کے علاوہ تمام دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور اپنے دادا محترم کے اصول پر انتہائی خاموشی اور خلوص کے ساتھ احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ تادم آخر انجام دیتے رہے۔ چوں کہ ابھی ان کی عمر ایسی نہیں تھی، جس میں انسان کو بڑے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے، لیکن دعوتی کاموں میں ان کی فکر مندی، روابط و تعلقات اور اس سلسلے میں ان کی کوششوں اور اسفار نے ان کو بڑے تجربوں سے گزار دیا تھا۔ ان کے انتہائی اہم دینی و دعوتی و اصلاحی مشاغل اور کارناموں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین کی خدمت کے لیے قبول فرمالیا ہے۔

اصحاب دعوت و عزیمت میں جو چیزیں نمایاں تھیں، میں بغیر مبالغے کے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا سید عبداللہ حسنی مرحوم میں وہ تمام باتیں نظر آتی تھیں۔ بہت سے غیر مسلمین ان کی مجلس میں آتے تھے اور وہ ان کے سامنے اسلام کی خوبیاں پیش کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کی مساعی اس سلسلے میں انتہائی مؤثر ہوتی تھیں۔ بہت سے اللہ کے بندے دائرۂ اسلام میں انتہائی پختگی کے ساتھ داخل ہوگئے۔ اُن میں سے بعض ڈاکٹروں اور تعلیم یافتہ لوگوں سے میری ملاقات ہوئی، جن سے گفتگو کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ پیدائشی مسلمان ہیں۔

مولانا عبدالعلیم فاروقی
(مہتمم دارالمبلغین، لکھنؤ)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو مولانا عبداللہ صاحب سے بہت محبت تھی۔ خود مولانا عبداللہ صاحب فرماتے تھے کہ حضرت مولانا انہیں اپنے سے قریب رکھتے

تھے اور ان کی تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ مولانا عبداللہ صاحب نے حضرت مولانا سے اصلاح کا تعلق قائم کیا اور اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ مولانا عبداللہ صاحب کو حضرت مولانا سے جو محبت تھی، اُس میں والہانہ انداز بھی تھا اور حضرت مولانا کی عنداللہ مقبولیت اور اخلاص و بزرگی پر اتنا مضبوط اعتماد بھی، جس سے زیادہ مضبوط اعتماد کا تصور مشکل ہے۔ انھوں نے مجھ سے خود یہ فرمایا کہ وہ حضرت مولانا کے کسی ارشاد کو اس کے عندیہ و مفہوم کی سطح پر نہیں بل کہ لفظی سطح پر لیتے ہیں۔ حضرت مولانا جو الفاظ ارشاد فرماتے ان ہی پر عمل کرنا مولانا عبداللہ صاحب کی ترجیح ہوتی تھی۔ وہ ان الفاظ میں کسی دوسرے مفہوم کی گنجائش پر غور کرنے اور ان میں اپنی پسند کا پہلو ڈھونڈنے کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ بارہا ذکر کرتے تھے کہ حضرت مولانا کے حق میں جو مقبولیت کا اثر سامنے آچکا ہے، اس کے علاوہ ابھی ان کی دعوت کا اثر سامنے آنا باقی ہے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ اگر حضرت مولانا کی کتابوں پر صحیح طریقے سے کام کیا جائے اور ان کے پیغام کو عام کیا جائے تو اس کے اثر سے ایک عظیم انقلاب پیدا ہوگا۔

ڈاکٹر شاہ عباد الرحمٰن نشاط

(سابق پروفیسر شعبۂ انگریزی جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ)

○

برادر مکرم مولانا عبداللہ محمد الحسنی علیہ الرحمہ ہمارے چھوٹوں میں تھے، اسی لیے تعلیم کے مرحلے میں کہیں ان کے ساتھ رفاقت کا معاملہ نہیں رہا، لیکن گھریلو تعلقات میں قرب، واقفیت اور تعلق کا معاملہ رہا۔ ان کے والد بزرگ وار مولانا محمد الحسنی علیہ الرحمہ ہماری زبان پر اسی طرح چچا تھے جیسے ہمارے عم گرامی قدر مولانا ڈاکٹر اجتباء ندوی علیہ الرحمہ تھے اور ان دونوں میں باہم ایسی ہی مودت و محبت اور بے تکلفی تھی جیسی والد صاحب اور مولانا محمد ثانی حسنی علیہما الرحمہ کے درمیان تھی۔

مولانا عبداللہ صاحب دارالعلوم کے احاطے میں ہم سب کے بعد آئے اور وہیں

سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ صلاح وسادگی جو اس خاندان کا امتیازی وصف ہے، اس سے تو متصف تھے ہی، صلاحیت سے بھی آراستہ تھے۔ اس کی وجہ سے دارالعلوم کے احاطے میں بحیثیت استاذ ہی نہیں بہ طور مربی بھی ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان سے مستفید ہونے والے بہت سے طلباء اس نسبت وحیثیت سے ان سے ایک خصوصی ربط رکھتے تھے اور استفادہ کرتے اور وہ بھی ان کی سرپرستی فرماتے اور اس طرح ایسے طلباء دارالعلوم کے احاطے سے باہر جانے کے بعد علمی وعملی سطح پر اچھا کام کرتے تھے۔ یہ ان کا بڑا فیض ہے اور مزید جو کام وہ اپنی خاموشی وحکمت عملی کے ساتھ کرتے رہے اور اپنے ساتھ ایک ٹیم کو بھی لگائے رکھا وہ ایک الگ ان کا امتیازو وصف ہے۔

عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود میرے لیے وہ انتہائی محترم تھے کہ ہمارے مرشد ومربی خانوادے سے ان کا تعلق تھا اور پھر ان کی نمایاں صفات۔ ملاقات جب ہوتی تو برادرانہ ہی نہیں عزیزانہ محبت ومسکراہٹ اور بے تکلفی کے ساتھ، چوں کہ اب ایک عرصے سے میرا قیام زیادہ تر کیا بل کہ ایک درجہ مستقل باندہ میں ہے، اس لیے ملاقات کم اور کم وقت کے لیے ہوتی لیکن ان سے مل کر ایک سرور حاصل ہوتا تھا۔

مولانا عبیداللہ اسعدی

(سکریٹری اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا)

○

مولانا عبداللہ حسنی برصغیر کے اس نہایت برگزیدہ اور عالی نسب خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس میں شاید ہر دور میں دعوت وعزیمت کی تاریخ رقم کرنے والے عظیم علماء ربانیین پیدا ہوئے۔ وہ خاموش طبع تھے۔ عربی اور اردو دونوں تقریر وتحریر پر اچھی قدرت رکھتے تھے۔ اپنے ابا میاں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تو تھے ہی اُن کی عقیدت کا اصل مرکز، تاہم وقت کے دوسرے بزرگوں سے بھی عقیدت واحترام کا تعلق رکھتے تھے۔ حضرت مولانا کی خاص نظر ان پر تھی۔ تربیت کے مرحلے سے گزار کر انھوں نے ان کو تزکیہ

وارشاد اور عمومی دعوت کے کاموں پر مامور بھی کر دیا تھا اور وہ نہایت خاموشی اور سنجیدگی و وقار کے ساتھ ان سب کاموں میں لگے رہتے تھے۔ان کے قریبی لوگوں کو بھی ان کے حلقے کی وسعت اور کام کے پھیلاؤ کا اندازہ ان کے انتقال کے بعد ہی ہوا۔میرا خیال تو بعض قرائن کی وجہ سے یہ ہے کہ ہمارے مولانا عبداللہ حسنی کو بھی دعوت کی راہ میں شہادت کا شرف ملا ہے۔حقیقت اللہ بہتر جانے۔

برادران وطن میں دعوت کا کام مولانا اس انداز سے کرتے تھے کہ نہ لمبی چوڑی فتوحات کی کارگزاریاں اور نہ کراماتی واقعات کی لن ترانیاں۔ایک خاموش اور سنجیدہ انداز تھا۔نہ صلے کی تمنا اور نہ ستائش کی پرواہ۔

سچ عرض کرتا ہوں کہ موت سے متصلاً قبل کے احوال سن کر بے حد رشک آیا مولانا عبداللہ حسنی کی قسمت پر۔ان کی زندگی ہم جیسوں کے لیے قابل رشک تو تھی ہی، موت زندگی سے بھی بڑھ گئی۔

مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی

(مدیر ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ)

○

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی سے میرا نہ استاذی وشاگردی کا رشتہ تھا، نہ مرشد اور مسترشد کا اور نہ کوئی دوسرا۔لیکن میں نے ہمیشہ انھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا ہے اور جہاں کہیں موقع ملا ہے، اُن کی صحبت میں بیٹھا ہوں۔ان کی باتیں سنی ہیں اور ان سے گفت وشنید بھی کی ہے اور جب بھی ان سے الگ ہوا ہوں، مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ مجھے کچھ ملا ہے۔ان کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں جا رہا ہوں۔خصوصاً ان کی نجی گفتگو یا عام تقریر مجھے اس وقت بہت بھاتی تھی اور دل پر بڑا دیرپا اثر چھوڑتی تھی، جب اس میں تھانوی حکمت و جمال کی مہک محسوس ہوتی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تعلیمات وملفوظات کو انھوں نے ہضم کر رکھا ہے۔

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے تقویٰ وطہارت اور استغناء وتوکل کی وجہ سے خُردوں و بزرگوں دونوں میں مقبول ومحبوب تھے۔ وہ اپنے کمال علم وفضل کے باوجود نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ یہ تواضع اور منکسر المزاجی ان کی چال ڈھال اور اٹھنے بیٹھنے میں بھی ملتی تھی اور لباس اور بات چیت میں بھی۔ وہ ہر قسم کی ظاہری نمود ونمائش سے گریزاں تھے۔ خاک ساری، فروتنی اور سادگی کو ان کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن ان سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں غیر معمولی کشش اور محبوبیت رکھی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے ''پیام انسانیت'' کی تحریک کے تحت جو عظیم خدمات انجام دی ہیں اور انسانی برادری کی ایک بڑی تعداد تک جو حق کی دعوت پہنچائی ہے اور اس کے لیے اپنے شاگردوں اور وابستگان کی جو ٹیم تیار کی ہے، یہ سب چیزیں ان کے درجات کی بلندی کا سبب بنیں گی اور دین حق کی اشاعت وتبلیغ کی تاریخ میں انہیں تادیر فراموش نہ کیا جاسکے گا۔

ڈاکٹر تابش مہدی

(نائب صدر ادارہ ادب اسلامی ہند)

○

جو لوگ مولانا عبداللہ حسنی صاحب کے نام سے اور ان کے کام سے اور ان کی دعوتی اور اصلاحی خدمات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے ایک خاص حلقے میں کیسا انقلاب برپا کردیا تھا اور ان کو یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے انتقال پر ملال سے کیسا افسوس ناک خلاء پیدا ہوگیا ہے:

وفات پاچکے سب رہ روانِ جادۂ عشق
ملال یہ ہے کہ دہلیز عاشقاں بھی گئی

ایک بار رمضان کے زمانے میں راقم سطور کا رائے بریلی جانا ہوا تھا۔ حیرت وتعجب کی انتہاء نہ رہی تھی، جب اس نے دیکھا کہ پندرہ سولہ نومسلم حضرات مسجد میں

اعتکاف کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ مولانا عبداللہ حسنی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے، جن میں چند لوگ اعتکاف کے لیے آئے ہوئے تھے۔

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ایک ادارہ تھے۔ تربیت کا مرکز تھے۔ کئی دینی اداروں کے روح رواں تھے۔ خود ایک تحریک تھے۔ دین کے سپاہی بھی تھے۔ سپہ سالار بھی تھے۔ لشکر جرار بھی تھے۔ مردم گری اور انسانیت کی چارہ سازی کے لیے بے چین رہتے تھے۔ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ طلبہ کی تعلیمی اور اخلاقی تربیت کا فریضہ بہت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ ان کے عربی مضامین جو ''الرائد'' میں شائع ہو رہے تھے، وہ دینی اور علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جا رہے تھے۔ اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے اور قدرت نے انھیں کچھ زیادہ وقت دیا ہوتا تو وہ مسلمانوں کی بہت مقبول نمائندہ اور مثالی شخصیت بن جاتے۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

(سابق صدر شعبۂ عربی ای ایف ایل یونی ورسٹی، حیدرآباد)

○

حضرت مولانا عبداللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر سن کر سخت صدمہ ہوا۔ مولانا ایک جلیل القدر عالم دین، داعی حق اور مربی جلیل تھے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی بورڈ آف اسٹڈیز کے اہم رکن تھے۔ اس محرومی پر تمام طلبہ و اساتذہ غم زدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محنتوں کو قبول فرمائے اور بلند درجات بخشے۔ اس سانحے میں اہل ندوہ کے ساتھ پوری امت مسلمہ شریک ہے۔

پروفیسر احتشام احمد نظامی

(ڈائریکٹر مرکز علوم القرآن علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ)

○

اخبارات کے ذریعے یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ حضرت مولانا عبداللہ حسنی صاحب

اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ چوں کہ میں مولانا کی علمی وتحریکی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھا، اس لیے اس خبر سے دلی صدمہ ہوا۔ خاص طور سے اس لیے کہ ایک پوری نسل کو انھوں نے اسلامی علوم وفنون سے آراستہ کیا اور میدانِ دعوت وعمل میں انھیں بھیج کر ملت پر احسان عظیم کیا۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں مرحوم نے پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے برادرانِ وطن کو عقائد اسلامی سے جس طرح فیض پہنچایا، وہ ہندستان کے تناظر میں عظیم کارنامہ ہے۔ تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ اس طرح کی تحریکی خدمات انجام دینا کم لوگوں کے نصیب میں آتا ہے۔ غرض یہ کہ اب ان کی خوبیاں ایک ایک کر کے یاد آئیں گی اور انھیں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا جاتا رہے گا۔

مولانا نظام الدین اصلاحی

(استاد تفسیر جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ وسرپرست راشٹریہ علماء کونسل)

○

مولانا سید عبداللہ حسنی نبوی اخلاق کے حامل تھے۔ دین ودنیا میں کام دینے والی بات کے سوا زبان سے کوئی لفظ ادا نہ کرتے۔ ان کا دل ہر طرح کی کدورتوں سے آئینے کی طرح شفاف تھا۔ زبان اور ہاتھ سے کسی کو کوئی اذیت بھولے سے بھی نہیں پہنچنے دی۔ غیبت اور بدگوئی خود کرتے نہ کسی سے سنتے۔ بل کہ اگر کوئی ان کی مجلس میں کسی پر حرف تنقید زبان پر لاتا تو فوراً موضوعِ سخن تبدیل کر دیتے۔ حسد، کینہ، بغض، منفی تنافس اور کسی کی بے آبروئی اور پردہ دری سے کبھی کوئی سابقہ نہ ہوا۔ نیز وہ ''حسنی السیرۃ'' بھی تھے۔ کشادہ دل، سیر چشم، اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے عذر تلاش کرنے والے، لغزشوں سے درگزر کرنے والے، اختلافی مسائل میں باہمی گفتگو اور مذاکرے پر عمل کرنے والے انسان تھے۔ گرم گفتاری اور کرخت کرداری سے کوسوں دور رہتے۔ انسان کی صرف خوبیوں پر نظر رکھتے اور خرابیوں سے چشم پوشی کرتے۔ مجھے ان کی اُس وقت کی شبیہ یاد ہے: سبزہ آغاز، پاک دل، پاک سیرت، موہنی صورت، معصومیت اور اخلاقی پاکیزگی کی صورت نوجوان۔ آواز

میں نرمی، اخلاق میں شیرینی، برتاؤ جادوگری، ہونٹوں پہ مسکراہٹ، آنکھوں میں ایمان کی چمک، پیشانی سے دین داری وعفت مآبی کی روشنی ابلتی ہوئی، زبان سے سچائی کے پھول جھڑتے اور کردار سے دامنِ دل کو تھامنے والی سچائیاں مخاطب پر اپنا جادو دکھاتیں۔

وہ متعدد مدرسوں، مکاتب اور انجمنوں کے ذمے دار اور سرپرست تھے۔ انھوں نے ملک اور بیرون ملک کا بہت بار علمی و دعوتی سفر کیا۔ اندرون ملک تو بہت زیادہ ان کی آمد ورفت اور چلت پھرت رہی۔ کیوں کہ تدریسی کام کے ساتھ ان کے دعوتی کاموں کا دائرہ خاصا کشادہ تھا۔ وہ جہاں جاتے دینی اکتسابات اور دعوتی فتوحات کا بڑا ذخیرہ ان کے دامن میں ہوتا۔ ان کی سیرت اور بھولی بھالی صورت میں مقناطیس کی کشش تھی۔ لوگ ان کی طرف اُسی طرح کھنچتے تھے جیسے مقناطیس کی طرف آہن پارے۔

مولانا نور عالم خلیل امینی

(استاد ادب دارالعلوم دیوبند و مدیر اعلیٰ ماہنامہ الداعی، دیوبند)

○

موصوف مرحوم کے سانحۂ وفات سے خانوادۂ حسنی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء بالخصوص اور ملت اسلامیہ بالعموم ایک جلیل القدر عالم دین، ایک کامیاب استاذ حدیث، ممتاز داعی اسلام اور ایک فکرمند، وسیع النظر متواضع شخصیت سے محروم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ موصوف کا بدل عطا فرمائے، ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اور سبھی پسماندگان کو صبر جمیل واجر جزیل عطا فرمائے۔

مولانا شبیر احمد سالوجی

(دارالعلوم زکریا، ساؤتھ افریقہ)

○

مولانا مرحوم کامیاب استاد، ہردل عزیز مربی اور مخلص مبلغ وداعی تھے۔ یہ حادثہ صرف حسنی خاندان اور ندوے کے لیے نہیں بل کہ پوری ملت کے لیے غم ناک ہے۔ لائق

افراد اٹھتے جارہے ہیں اور ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں۔

ڈاکٹر فرحان احمد نظامی

(آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز، لندن، برطانیہ)

○

یہ صدمہ اور حادثہ خانوادۂ حسنی کے لیے، تکیہ کلاں رائے بریلی کے مکینوں کے لیے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اہالیان کے لیے اور عموماً ساری امت کے لیے دل کو رنجور، قلب کو مغموم کرنے والا ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنا مایہ ناز استاذ، جید عالم دین اور عامل کھویا۔ حسنی خاندان نے اپنا ہر دل عزیز چشم و چراغ کھویا اور اہالیان ندوۃ العلماء نے ایک اچھا مدرس، مصلح اور شب زندہ دار عابد و زاہد کھویا۔

مولانا مرحوم اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے۔ دو تین مرتبہ حضرت مرحوم نے جامعہ تشریف آوری فرمائی۔ بڑے ہی درد و سوز میں ڈوبا ہوا بیان فرمایا۔ قرآنی نکات بڑے اچھوتے انداز میں واضح فرمائے۔ بڑا ہی مؤثر اور مسحور کن بیان فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین۔

مولانا مفتی عبداللہ مظاہری

(جامعہ مظہر السعادۃ، ہانسوٹ، گجرات)

○

مرحوم کی پوری زندگی خدمت اسلام سے عبارت اور اشاعت دین سے وابستہ تھی۔ تاہم پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے آپ کی داعیانہ و قائدانہ خدمت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ امت کو اس کا نعم البدل عنایت فرمائے نیز رمضان المبارک میں خانقاہی سلسلے کی آپ کی روحانی خدمات بالخصوص حدیث کا مقبول درس بھی شرکاء خانقاہ کو ان کی یاد تازہ کراتا رہے گا۔ آپ کا دل نشیں درس اور نکتہ رس تحریرات بھی آپ کے شیدائیوں کو آپ کی کمی کا احساس دلاتی رہیں گی۔ ندوۃ العلماء جہاں ایک قابل استاد،

مشفق مربی اور کامل راہ بر سے محروم ہوا، وہیں پوری ملت اسلامیہ بل کہ انسانیت بھی ایک مخلص کارکن اور بے لوث خدمت گار سے محروم ہوگئی۔

مولانا مفتی احمد دیولوی
(جامعہ علوم القرآن، جمبوسر، گجرات)

○

مولانا عبداللہ حسنی ندوی قدس سرہ نے تصوف میں بڑا امتیاز حاصل کیا تھا۔ ان کے مریدین کیرالا سے شمالی ہند تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے انتخاب کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا عبداللہ حسنی کو اپنا خلیفہ منتخب کیا تھا۔ ان کے بعض مریدین علی گڑھ میں بھی ہیں۔ تصوف و تبلیغ کا بڑا کام انھوں نے اس چھوٹی سی عمر میں انجام دیا۔ ان کے ہاتھ پر بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ اللہ کی دین اور توفیق ہے جس سے چاہتا ہے کام لے لیتا ہے۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
(علی گڑھ)

○

مولانا مرحوم کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ تمام علمی حلقے میں رنج و غم کا پھیل جانا لازمی تھا۔ چوں کہ میں بھی بہ ذات خود مولانا مرحوم کے مداحوں میں تھا اور ان کی شفقت و محبت مجھے نصیب تھی اس لیے اس خبر نے مجھے بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان سے میرا یہ تعلق ۱۹۸۹ء میں اس وقت قائم ہوا تھا جب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایماء پر ہم لوگوں نے پیام انسانیت کی اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس عین بھاگلپور فرقہ وارانہ فساد کے بعد دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں منعقد کی تھی، جس میں آں جہانی ڈاکٹر بی این پانڈے، حضرت مولاناؒ کے علاوہ ملک کی مختلف پارٹیوں کی اہم شخصیتوں نے شرکت کی تھی اور جو بہت کامیاب رہی تھی۔ اس کے بعد سے ہی مرحوم سے یہ تعلق پروان چڑھتا رہا۔ جب بھی ندوے میں حاضری ہوئی بہت بے تکلف ہو کر شفقت و محبت اور تپاک سے ملتے تھے۔ ان کی رحلت کی خبر سے مجھے

بھی بے حد ملال ہے۔ ان کی خوش اخلاقی، تواضع اور انکساری کو میں کبھی بھلا نہیں پاؤں گا۔ آپ کے تمام کنبے پر ان کی موت سے غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور آپ سب کا ذاتی نقصان تو ہے ہی، لیکن اس سے بھی زیادہ ملک وملت کے لیے ایک ایسا خسارہ ہے جس کی بھرپائی شاید ہی ہو سکے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں اپنے ایک مخلص خیر خواہ اور دعا گو کی دعاؤں سے محروم ہو گیا ہوں۔

ویسے بھی ۵۵ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، اس عمر میں انھوں نے اپنی علمی صلاحیت، خاک ساری، انکساری، بردباری اور بلند اخلاق کی بناء پر اپنی ایک الگ پہچان بنالی تھی اور ایک جلیل القدر عالم دین اور عالم باعمل انسان بن گئے تھے۔ ان سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ ان کی ذات ایک روشن ستارے کی شکل میں ندوے کی سرزمین کو جگمگاتی رہے گی لیکن معلوم ہوا کہ مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان کے جانے سے جو خلاء ملت اسلامیہ کے لیے پیدا ہو گیا ہے اس کا پر کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔

ڈاکٹر عبدالمنان
(دہلی اسٹیٹ کینسر انسٹی ٹیوٹ، دہلی)

○

یہ الم ناک خبر سن کر دلی صدمہ ہوا کہ حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا انتقال پر ملال ہو گیا۔ حضرت مولانا کو حق تعالیٰ نے مختلف خوبیوں سے نوازا تھا۔ احقاق حق اور ابطال باطل اور خاص کر غیر مسلموں کو مذہب اسلام سے واقف کرانے اور دین برحق کی دعوت دینے کا جذبہ وحوصلہ آپ کے قلب وجگر میں پیوست کیا تھا۔ مولانا مرحوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں درس وتدریس کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ بڑی خاموشی اور اخلاص کے ساتھ ریا اور نمود سے اپنے آپ کو کوسوں دور رکھتے ہوئے انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ دین اسلام کی اشاعت کرتے رہے۔

مولانا اسلام الحق اسجد صدیقی قاسمی
(مہتمم ادارہ محمودیہ محمدی، لکھیم پور کھیری، یوپی)

○

مولانا عبداللہ حسنی ندوی نے اپنی بالغ نظری اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے اور کام پر لگائے ہوئے اپنے تربیت یافتہ معتدل فکر شاگردوں اور مسترشدین کے واسطے سے، جن کی بڑی تعداد ملک کے مختلف حصوں میں کام کر رہی ہے، تحریک پیام انسانیت کی آواز کو ملک بھر میں پھیلایا۔ اس کے بہت کامیاب اجلاس منعقد کرائے۔ ان کی اس کوشش کے بہت مبارک بل کہ حیرت ناک نتائج ظاہر ہوئے۔ بڑے بڑے ہندو رہنما، شنکر آچاریہ جو اسلام کو آتنک وادی (دہشت گرد) مذہب لکھتے تھے اور برادران وطن میں اشتعال کے لیے مشہور تھے، وہ اسلام کو آدرش (آئیڈیل) لکھنے اور کہنے لگے۔ ایسے لوگ بڑے بڑے اجلاس میں کھلے عام اسلام کی حقانیت اور اسلام کے رحم دلانہ نظام کے نہ صرف معترف بل کہ داعی بن گئے۔ یہ صرف اور صرف مولانا کا ایسا داعیانہ اور قائدانہ کارنامہ ہے، جس کو اگر مولانا مرحوم کی کرامت کہا جائے تو بجا ہے۔

مولانا عبداللہ حسنی ندوی نے اپنی زندگی، سوچ اور تگ و دو کا اصل مرکز دعوت اسلامی کو بنایا اور افراد سازی اور ذہن سازی کا بڑا کام اللہ تعالیٰ نے مولانا محترم سے لیا۔ دیکھتے دیکھتے ان کی تربیت یافتہ اور دعوتی صلاحیت سے لیس ایک جماعت ملک میں تیار ہوگئی۔ اس کے لیے انھوں نے سیرت پاک کے موضوع پر غیر مسلموں کے اسکولوں اور کالجوں میں مقالات اور تقریروں کے بڑے مسابقے اور مقابلے کرائے اور ان میں تقسیم انعامات کے عنوان سے بڑے بڑے اجلاس منعقد کرائے، جس سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے لوگوں کے دلوں کے جالے دور ہو کر نہ صرف لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام کے قریب ہوئے، بل کہ نہ جانے کتنے کافروں، شدھیوں اور کفر و ضلالت کے بھٹکے لوگوں کی ہدایت کے فیصلے ہوئے اور کتنے اسلام کے دشمن اسلام کے داعی بن گئے۔

مولانا مرحوم کی عمر اگر چہ ۵۵ سال سے متجاوز ہوئی، جو عمر طبعی ہونے کے باوجود زیادہ عمر نہیں کہلاتی، وہ چاروں طرف اپنے فیوض و برکات پھیلاتے پھیلاتے ایسا لگا جیسے

ابھی درمیان تقریب ہم سب سے روٹھ کر اپنے محبوب حقیقی کی آغوش رحمت میں چلے گئے۔ مگر چھوٹی سمجھی جانے والی اس عمر میں مولانا نے اپنی عبقری صلاحیتوں سے کتنے میدانوں میں مثالی کارنامے انجام دیے۔

مولانا محمد کلیم صدیقی

(صدر جمعیۃ شاہ ولی اللہ پھلت، مظفر نگر، یوپی)

○

مولانا عبداللہ حسنی صاحب کے ناقابل فراموش کارناموں میں افراد سازی کو سب سے نمایاں وصف شمار کیا جائے گا۔لیکن اس وصف میں دوسرا جو اہم وصف جڑا ہوا تھا، وہ یہ کہ ان کے ذریعے اللہ رب العزت نے ان کم زور سمجھنے والوں اور کم صلاحیت کے حامل خیال کیے جانے والوں، بل کہ بعض ایسے افراد و اشخاص کو میدان میں پہنچادیا جن سے خود ان کے والدین و اساتذہ بھی مختلف وجوہات سے ناامید ہو چکے تھے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بعد ہندستان میں مولانا کی فکر و سوچ کے مطابق جو بے شمار مدارس و مکاتب اور دینی و دعوتی ادارے ہمارے ملک میں وجود میں آئے، اُن کی ایک بڑی تعداد کے لیے سب سے زیادہ محرک اور واسطہ بننے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو عطا فرمائی تھی۔

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

(جنرل سکریٹری مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی، بھٹکل، کرناٹک)

○

حضرت مولانا بڑی خاموشی، دانائی، بصیرت، حکمت عملی اور مجاہدانہ عزم کے ساتھ انسانیت کی خدمت میں مصروف تھے۔ان کی ہر دل عزیزی و مقبولیت ہر در و بام پر دستک دے رہی تھی۔ ہند و بیرون ہند کے بہت سے مقامات پر آپ کی متنوع خدمات کے شجر سایہ دار سے نہ معلوم کتنے تھکے ہاروں کو تسکین ملی اور آپ کی زبان و قلم کی بوقلمونیوں اور

نفس گرم کی آمیزش نے کوہ شوالک کے دامن سے لے کر کنیا کماری تک، کشمیر کی برفیلی وادیوں سے لے کر مالابار کی سرزمین تک، لکھنؤ کی ادبی فضاء سے لے کر بحر ہند کے ساحلوں تک، راجستھان کے ریگ زاروں سے لے کر گلابی شہروں تک، پنجاب کے بت کدوں سے لے کر ہمالیہ کی آغوش تک نہ معلوم کتنے قلوب کو جھنجھوڑا، تڑپایا اور ان کی سرد انگیٹھی کو گرم کیا ہے۔ اس وقت آپ کے مجاہدات کا دور ختم اور فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا تھا۔ ہدایت اور راہ عمل کے بہت سے دروازے وا ہوتے جارہے تھے۔ کام عروج و شباب پر تھا۔ اچھے برگ و بار اور نتیجہ خیز نتائج کی توقعات کی جارہی تھیں اور آپ کے تربیت کردہ افراد کا ایک جم غفیر آپ کے ایک اشارۂ ابرو پر کام کو وسعت دینے، دائرۂ کار کو بڑھانے میں خود کو نچھاور کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ حکیم و قادر ہیں۔ ان کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے پاس بلالیا۔ ہم سب مشیت ایزدی پر راضی ہیں۔ اب وہ جس کام پر لگا گئے ہیں، اُسے انجام دینے کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔

مولانا محمد ناظم ندوی

(صدر المعہد الاسلامی، مانک مئو، سہارن پور)

○

مولانا عبداللہ حسنی کو اللہ تعالیٰ نے عجب عزم و حوصلہ عطا فرمایا تھا۔ کیسے ہی سخت سے سخت حالات ہوں، مایوسی و قنوطیت کی کوئی جھلک تک نظر نہیں آتی تھی۔ ایک مرتبہ خاص موقعے پر پرزور و پراعتماد لہجے میں فرمایا: ''میرے پاس حالات کا شکوہ اور مشکل کا ذکر مت کیجیے۔ مشکل کیا ہوتی ہے؟'' مولانا ''نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو'' اور ''اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل'' کا سراپا تھے۔

رابطۂ ادب اسلامی کا ایک روزہ سمی نار بھوپال میں منعقد کیا گیا، جس کی صدارت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو کرنا تھی۔ لیکن اچانک ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے سفر نہ ہوسکا۔ مولانا عبداللہ حسنی کو حضرت نے بھیج دیا۔ اردو اکیڈمی بھوپال کا وسیع ہال سامعین

سے بھرا ہوا تھا۔ جب مولانا عبداللہ حسنی نے ادب اسلامی پر تقریر فرمائی تو پورا ہال عش عش کر اٹھا۔ ایک بہت ہی تنقیدی ذہن رکھنے والے قدیم ندوی نے فرمایا: "ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ علی میاں کی روح بول رہی ہے۔ ہم آج عبداللہ حسنی کے قائل ہو گئے۔"

مولانا قاضی سید مشتاق علی ندوی

(قاضی ریاست بھوپال، مدھیہ پردیش)

○

حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا سانحۂ وفات بڑا کرب ناک، اندوہ ناک اور ملال آگیں حادثہ ہے۔ ایسا حادثہ جس کو نہ سمع و بصر قبول کر رہے ہیں، نہ ذہن و دماغ۔ کانوں نے یہ الم ناک خبر سنی، آنکھوں نے یہ روح فرسا منظر دیکھا، دل نے شدید کرب و اضطراب محسوس کیا، پھر نہ جانے کیوں وہ چلتے پھرتے، درس گاہ میں قال اللہ و قال الرسول کی صدائے مشک بار سے طالبین کو گوش بر آواز کرتے ہوئے، مجالس معرفت کو کلمات عالیہ ارشادات غالیہ سے معمورۂ انوار بناتے ہوئے، گم کردہ راہ، سسکتی بلکتی انسانیت کو پیغام حق سے سرشار کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ رخصت ہو گئے۔ ان کی منزل ختم ہو گئی یا ان کی تحریک دم توڑ گئی یا ان کا آوازۂ حق خاموش ہو گیا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ تقریباً چھپن سال اس عالم رنگ و بو میں گزارے۔ لگ بھگ چار دہائی تعلیم و تبلیغ، ارشاد و تلقین اور دعوت و اصلاح کے کام میں گزارے۔ یقین نہیں آتا کہ اتنے کم وقفۂ حیات میں عظیم ترین کارہائے نمایاں کس طرح انجام دیے۔

مفتی جمیل الرحمٰن قاسمی

(مہتمم جامعہ رحمانیہ، ہاپوڑ، یوپی)

○

مولانا جس خاندان کے سپوت تھے، اس کی اصلاحی، دعوتی، تجدیدی اور علمی و ادبی خدمات مہر تاباں بن کر تاریخ کے صفحات پر درخشاں ہیں۔ آپ اس محبوب خلائق ہستی

کے پوتے تھے، جو ہندستان کی آزادی کے بعد اسلامیان ہند کی سب سے بلند قامت شخصیت تھی۔ آپ اس نیک طینت انسان کے لخت جگر تھے، جو عربی زبان وقلم کا بادشاہ اور فکر اسلامی کا سرخیل تھا۔ آپ اس جہاں دیدہ ہستی کے عزیز وقریب اور نسبتی فرزند ارجمند (داماد) تھے، جو ملت اسلامیہ ہندیہ کے موجودہ رواں دواں کارواں کا میر و پاسباں اور دریائے حکمت ودانائی کا شناور ہے۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس تھی کہ مولانا عبداللہ حسنی تحمل وبردباری، وفاکیشی ورواداری، غیرت دینی وحمیت اسلامی، دعوت واصلاح، اتباع سنت وشریعت، سلوک وتصوف اور زہد واستغناء میں تیز گام وسبک خرام ہوں۔

اللہ کی سنت کے مطابق ۳۰؍جنوری ۲۰۱۳ء کو مولانا ہم سے بچھڑ گئے۔ ہم نے ان کو نم ناک آنکھوں، زخمی دلوں، لرزیدہ قدموں اور سسکتے جذبات کے ساتھ آغوش قبر کے حوالے کردیا۔ وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور قحط الرجال کے اس نازک دور میں وہ کئی محاذ کو سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ کردار کے آدمی تھے اور اپنی تعلیم وتربیت کے ذریعے اس گوشے پر خصوصی توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ ان کے کام کے ہمہ جہت پہلو تھے۔ وہ ایک مدرس، ایک مربی، ایک نکتہ آفریں اور شیریں بیان واعظ، مصلحانہ شان کے ایک کام یاب داعی اور حکیمانہ انداز کے مبلغ تھے۔ راہ سلوک اور بیعت وارشاد کے ذریعے تزکیہ واحسان کی عظیم ذمے داری اٹھائے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کردار سازی اور مردم گری پہ ان کی خصوصی توجہ تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے آب حیات سے اپنے متوسلین کے اندر دین داری، ذوق عبادت، تعلق مع اللہ اور اصلاح ودعوت کے پودے کی آب یاری کرکے ایک گلستاں آباد کردیا۔

پچھلی صدی میں حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی کے سینے کو اللہ نے شریعت کی حکمت اور دین کے اسرار ورموز سے لبالب بھر دیا تھا اور زبان وقلم کو اس کا ترجمان بنادیا تھا۔ پھر اس حکمت ودانائی کا عکس جمیل حضرت قاری محمد طیب کی تحریر وتقریر میں نمایاں رہا اور

کچھ ایسا ہی رنگ مجھ ناچیز کو مولانا عبداللہ حسنی کے حکیمانہ وعظ و ارشاد اور نکتہ آفرینیوں سے مملو درس و تدریس میں نظر آیا۔

مولانا محمد علاء الدین ندوی
(وکیل کلیۃ اللغۃ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

○

حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی ایک روشن ضمیر، رہبرِ روحانی تھے۔ وہ امت کے سوختہ جاں بہی خواہ اور غم انسانیت سے معمور دل کے حامل مسیحا تھے۔ وہ نہ صرف ناصح تھے، بل کہ غم گسار بھی تھے، چارہ ساز بھی تھے۔ جو آپ سے مشورے لینے آتا، وہ سکون و راحت پاتا۔ ساری انسانیت کا درد مولانا کے دل میں تھا۔ وہ انسانیت کی ہدایت کا پیام لے کر بستی بستی قریہ قریہ سفر کرتے اور اس اثناء میں آپ کو نہ راحتِ منزل کی فکر ہوتی اور نہ نشاطِ رحیل کی۔ مقصد کی دھن، کام کی تکمیل کا جذبہ اور فکرِ انسانیت کا بوجھ شاید اسی نصب العین کی عکاسی کرتا تھا کہ:

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مولانا مرحوم نے اپنے اسلاف سے سماحت کی صفت وراثت میں پائی تھی۔ اپنی نجی زندگی میں قناعت و سادگی اور احباب و متعلقین کی خبر گیری آپ کا شیوہ تھی۔ دنیا سے بے رغبتی اور مال و منال سے بے نیازی آپ کا جوہر تھی۔ اخلاص کامل نے آپ کو کاملین کی اس صف میں کھڑا کر دیا تھا کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنا خلیفۂ مجاز قرار دیا۔ یہ وہی اخلاص ہے جس سے مولانا مرحوم فتنوں کو بھانپ لیتے اور ان کی سرکوبی کی فکر کرتے۔

ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی
(اسسٹنٹ پروفیسر ای ایف ایل یونی ورسٹی، حیدر آباد)

○

یہ جنوری کا مہینہ بھی کس قیامت کا تھا۔ تیس تاریخ تھی کہ یہ خبر صاعقہ اثر بن کر سب کو تڑپا گئی کہ مولانا عبداللہ حسنی ندوی نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ اب کوئی کیسے بتائے کہ ایک مختصر عمر میں مدت ہائے دراز کے فاصلوں کو طے کرنے والی یہ شخصیت کیا تھی؟ یقیناً ان کے نسب میں ابن محمد الحسنی ابن ڈاکٹر عبدالعلی ابن حکیم عبدالحئی جیسے نام ہیں، جو کسی بھی سلسلے کو زریں بنانے کے لیے کافی ہیں۔ وہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے پوتے، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے داماد تھے۔ وہ رائے بریلی کے تقدس مآب خانوادے کے گوہر شب چراغ تھے۔ لیکن ماتم کرنے کے لیے کیا یہ کافی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کم عمر عبداللہ حسنی میں ان کے اجداد کی وہ خوبیاں جھلملاتی تھیں، جو کسی بھی انسان کو اس لائق بناتی ہیں کہ اس سے محبت کی جائے۔ کم آمیزی اپنی جگہ لیکن اظہار کمال سے نفرت اور نمود و نمائش سے وحشت، یہ تو خاصان خدا کی خاص شناخت ہے۔

مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی
(رفیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

○

برادرم عبداللہ! اللہ آپ کو اپنی رحمتوں کی آغوش میں لے لے۔ آپ کی وفات پر نہ جانے کتنے دل غم زدہ ہوئے اور کتنی آنکھیں بہیں۔ یقین جانیے کہ آپ کی وفات پر مجھے جو صدمہ پہنچا ہے، ایسا صدمہ زندگی میں دو ہی مرتبہ ہوا۔ ایک اپنی مشفق و محترم والدہ کی وفات پر اور دوسرا آپ کے عظیم المرتبت دادا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی وفات پر۔ سچ کہتا ہوں کہ آپ کی وفات نے ہمیں حواس باختہ سا کر دیا۔ یہاں تک کہ ہم میں سے بہت سے تو رافعی کے الفاظ میں یوں شکوہ سنج ہونے لگے کہ ''اے ہمارے رب! تو نے ہمارے مقدر میں یہ حادثہ کیوں لکھا تھا؟ تو نے ایسا حکم کیوں جاری فرمایا؟'' پھر وہ توبہ کرتے ہوئے ہوش میں آتا ہے اور معذرت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اے ہمارے پروردگار! تیرا

فیصلہ سامنے آچکا اور تیرا حکم نافذ ہوگیا، لہٰذا مجھے معاف فرمادے اور دامنِ عفو میں جگہ عنایت فرما۔"

آپ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے لیکن آپ کی عطر بیز یادیں کبھی ختم نہیں ہوسکتیں۔ آپ کی خدمات اور فتوحات ہمیشہ ہماری یادوں کے دریچے میں محفوظ رہیں گی۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں

(عربی سے ترجمہ)

مولانا محمد نعمان الدین ندوی

(مدیر الصحوۃ الاسلامیۃ وصدر شعبہ عربی ادب دارالعلوم حیدرآباد)

○

جمعیۃ علماء اتر پردیش کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ممتاز استاذ حدیث وتفسیر مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی، حسنی خاندان کی اہم شخصیت، پیام انسانیت کے جنرل سکریٹری، "الرائد" کے مدیر اعلیٰ کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا کی وفات کو ملت اسلامیہ کے لیے ناقابل تلافی خلا تصور کرتا ہے۔ مولانا کی ہمہ جہات خدمات کا اعتراف کرتا ہے۔ مولانا مرحوم انتہائی سادہ، ملنسار، زہد وتقویٰ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق کے ساتھ ملت اسلامیہ ودارالعلوم ندوۃ العلماء کو نعم البدل عطا فرمائے۔ جمعیت علماء اتر پردیش اس سانحۂ عظمیٰ پر تعزیت پیش کرتی ہے۔

جمعیۃ علماء اتر پردیش

باب سوم

افکار و نظریات
اور
ملفوظات

انداز محبت کے کوئی سیکھ لے ہم سے
کہتے ہیں جسے عشق سو وہ فن ہے ہمارا

مصحفی امروہوی

اللہ کو اپنا بنایئے

ایک دفعہ ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو شخص جس چیز پر ہاتھ رکھ دے، وہ اس کی ہے۔ سارے وزراء اور وہاں حاضر سبھی حضرات نے جس نے بھی بات سنی، کسی نے ہیرے جواہرات پر کسی نے اور کسی قیمتی چیز پر ہاتھ رکھا۔ آخر میں بادشاہ نے دیکھا کہ اس کی ایک باندی کونے میں چپ چاپ کھڑی ہے، تو بادشاہ نے اس سے سوال کیا کہ تم بھی کچھ لے لو، تم کیوں چپ کھڑی ہو؟ باندی نے کہا: سوچ لیجیے۔ بادشاہ نے کہا: اجازت ہے۔ باندی گئی اور بادشاہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بادشاہ نے پوچھا: تمھیں ہیرے جواہرات اور بیش قیمت چیزوں میں دل چسپی نہیں ہے؟ مجھے ہی کیوں چنا؟ اس نے کہا: یہ ساری چیزیں ایک دن ختم ہو جائیں گی، لیکن جب آپ میرے ہیں تو یہ ساری چیزیں ملتی ہی رہیں گی۔ ٹھیک اسی طرح اللہ کی رضا کا سوال کرتے رہنا چاہیے۔ وہ ہمارا ہے تو سب کچھ ہمارا۔ دنیا بھی ہماری، آخرت بھی ہماری ہے۔

کلمۂ طیبہ کی مثال

کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اتنا بھاری ہے کہ ترازو کے ایک پلڑے میں کلمہ طیبہ رکھ دیا جائے اور دنیا، آسمان اور جو کچھ اس کے درمیان ہے وہ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو کلمہ طیبہ والا پلڑا وزن سے جھک جائے گا، لیکن ہم لوگوں نے سمجھا ہی نہیں۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ جیسے لفٹ ہوتی ہے۔ آپ لفٹ میں بیٹھ گئے اور جس منزل پر آپ جانا چاہیں، بٹن دبا دیں۔ بس آپ پلک جھپکتے ہی سو منزل، ایک سو دس، ایک سو بیس منزلہ طے کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سے اخلاص کے ساتھ معنی کو سمجھ کر محبت کے ساتھ لا الہ الا اللہ کا ذکر کیجیے۔ دیکھیے آپ کے کتنے درجے طے ہوتے ہیں۔

طلبۂ مدارس کے والدین کی بڑی غلطی

مدرسوں میں بچے آتے ہیں اور ان کو بہت سی باتیں بتائی جاتی ہیں، سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن یہی بچے جب اپنے گھروں میں جاتے ہیں تو جو کچھ ان کو بتایا جاتا ہے اس کے خلاف ان کو نظر آتا ہے۔ بل کہ اس کے خلاف وہاں ان سے کرایا جاتا ہے۔ اس طرح بچے دو کشتی کے سوار ہو جاتے ہیں۔ ایک پیر اِس کشتی میں ہوتا ہے تو دوسرا پیر اُس کشتی میں ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بچے حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ کریں تو کیا کریں؟ مدرسے کی طرف جائیں یا گھر کی طرف آئیں؟ دونوں ہی ان کے لیے عزیز ہیں، مدرسہ بھی اور گھر بھی۔ وہ پریشان رہتے ہیں۔ یہ تجربہ ہے ہم مدرسے والوں کو۔ اکثر و بیشتر ایسا ہی رہا ہے، جس کے نتیجے میں نہ تو وہ صحیح طور پر مولوی بن پاتے ہیں اور نہ بالکل اس طرح ہو کر رہ پاتے ہیں جس طرح گھر والے چاہتے ہیں۔ گھر والے چاہتے ان سے کچھ ہیں اور وہ چاہتے کچھ ہیں۔ اس طرح ایک عجیب و غریب کش مکش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کش مکش جب تک دور نہیں جائے گی، کما حقہٗ نتائج سامنے نہیں آئیں گے۔

ادھوری دین داری

اکثر و بیش تر حضرات نے زندگی کا بڑا حصہ غیر شعوری طور پر گزار دیا۔ اگر عمومی طور پر یہ بات کہی جائے تو شاید ان کو محسوس ہو اور برا لگے، لیکن ایک لفظ بڑھا دیں کہ دینی طور پر بے شعوری میں گزار دیا تو بالکل صحیح بات ہے۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم دین دار ہیں اور یہ سمجھ کر وہ صحیح طور پر دین کو سمجھ نہیں پاتے ہیں۔ کیوں کہ ادھوری دین داری ان کو حاصل ہوتی ہے اور اسی ادھوری دین داری پر راضی رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں مزید خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے: ''نیم ملا خطرۂ ایمان، نیم حکیم خطرۂ جان''۔ تو ایسے لوگ تو بعض دفعہ بڑے خطرے کا باعث بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نیم میں کڑواہٹ ہی ہوتی ہے تو اس

کے نتیجے میں ماحول بھی خراب ہوتا ہے۔ پریشانی بھی ہوتی ہے۔ نیم نہیں رہنا چاہیے، آم بن جانا چاہیے۔ آم بھی کڑوا ہوتا ہے؟ لیکن جب پک جاتا ہے تو میٹھا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جو نیم (آدھے) ہوتے ہیں وہ کڑوے ہوتے ہیں لیکن جب وہ پختہ ہو جاتے ہیں تو اتنے میٹھے ہو جاتے ہیں کہ تمام لوگوں کو مزہ آ جاتا ہے۔ ابھی کل تک تو بڑے کڑوے تھے اب میٹھے ہو گئے۔ تو آدمی کو ہر چیز میں پختہ ہونا چاہیے۔ پختگی عجیب چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نظام رکھا ہے کہ کوئی پھل ایسا نہیں جو کچا نہ ہوتا ہو اور پھر پکا نہ ہوتا ہو۔ ایسے ہی انسان بھی پہلے کچا ہوتا ہے، پھر پکا ہوتا ہے اور پکا انسان ہی اصل ہوتا ہے۔ کچا انسان اصل نہیں ہوتا ہے۔ بچے بے چارے بچے ہوتے ہیں، لیکن بالغ ہونے کے بعد کامل ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ہر جگہ ہے۔

سرپرستوں کی تربیت

مدرسے کے ذمے داروں کو اس طرح کام کرنا چاہیے کہ طلبہ کے سرپرستوں کی بھی تربیت ہو۔ لوگ اپنی ساری محنتوں اور کوششوں کو مدرسے پر لگا دیتے ہیں، لیکن پیچھے سے جو چیز آ رہی ہے، لوگ اس کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ جیسے زینہ ہے۔ تو زینہ جو نیچے والا ہے وہ بچے ہیں۔ اگر اوپر کا زینہ نہیں جھاڑا، صرف نیچے کا جھاڑتے رہے، تو اوپر سے کچرا آتا رہے گا۔ آپ کب تک جھاڑیں گے؟ آپ جب بھی جھاڑیں گے تو اوپر سے کچرا آ جائے گا۔ اگر آپ اوپر سے جھاڑ دیں اور نیچے سے بھی جھاڑ دیں تو پورا زینہ صاف ہو جائے گا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی طرف بھی توجہ کی جائے۔

مدارس کی کثرت

آج کل بہت سے ادارے بن گئے ہیں، جہاں دینی تعلیم کے نام پر تعلیم دی جا رہی ہے، لیکن ان کے اندر ملاوٹ ہے۔ ملاوٹ کی وجہ سے اس کا کماحقہٗ فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ اصل ملاوٹ کی بات یہ ہے کہ صحیح فہم نہیں ہے اور اس پر صحیح عمل نہیں۔ جب یہ چیزیں نہیں ہیں تو ملاوٹ ہوگی۔ اس لیے بہت جگہ حدیث و قرآن کا نام لیا جا رہا ہے، لیکن حدیث

وقرآن سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور ظاہری طور پر کچھ تعلق ہے تو اس سے کام نہیں چلے گا، بالکل صحیح علم ہونا چاہیے۔

قرآن کا ترجمہ نہیں ترجمانی

جب تک صحیح عربی نہ جانے اور علوم پر دسترس کامل نہ ہو، اس وقت تک آدمی قرآن وحدیث سے صحیح استفادہ کر ہی نہیں سکتا اور اگر اس کے بغیر کوئی دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ عربی زبان کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے۔ عربی زبان بہت وسیع ہے اور وسیع کا معمولی زبان میں ترجمہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑی عبارت ہو، اس کو آپ ایک سطر میں کرنا چاہیں تو کیسے کریں گے؟ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ عربی زبان بڑی عظیم ہے، بڑی وسیع ہے اس کا ترجمہ تو کوئی پوری طرح کر ہی نہیں سکتا اور جہاں تک سوال ہے قرآن مجید کے ترجمے کا تو کوئی کر ہی نہیں سکتا، کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کریں گے تو ہوگا کوئی اور کیسے کر سکتا ہے؟ جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے قرآن مجید کا، وہ ترجمہ نہیں، ترجمانی ہے۔ یعنی ترجمانی کی کوشش کی ہے۔ تو اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ صحیح عربی ہو اور محنت سے پڑھا جائے۔

مدارس اور طلبائے مدارس

مختلف چیزوں کے مختلف کارخانے ہوتے ہیں۔ آپ دیکھتے چلے جایئے کہیں صابن بن رہا ہے، کہیں بسکٹ، کہیں لوہے گلائے جا رہے ہیں۔ دیکھیے! کیل معمولی چیز ہے پھر بھی بنائی جا رہی ہے۔ تو ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو انسان بنانے کے کارخانے بھی رکھے ہیں، جہاں پر آپ کا اپائنٹمنٹ (Appointment) ہوا ہے۔ یہاں پر آپ کو انسانیت کا پیغام دیا جاتا ہے تاکہ یہاں سے انسان بن کر نکلیں اور پھر انسان کو انسان بنائیں اور اچھی زندگی گزارنے کا طریقہ بتائیں کہ انسان بن کر کیسے رہیں؟ کیسے لوگوں سے معاملات کریں؟ یہ ساری چیزیں آپ کو یہاں سکھائی جائیں گی۔ اگر آپ کو کارخانے میں

جو خدا کا کارخانہ ہے جس میں آپ کا تقرر ہوا ہے، ملازم رکھا گیا ہے، وقت کو ضائع کیا، تو اللہ آپ کو دے گا۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا جو آپ کے فارغین ہیں، وہ سیکھ کر یہاں سے نکلتے ہیں، دس دس سال سیکھ کر، بارہ بارہ سال سیکھتے ہیں اور سیکھنے کے بعد نکلتے ہیں، تو جنھوں نے اپنا وقت ضائع کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کارخانے میں رہ کر سیکھا نہیں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو یہاں سے خارج کر دیتا ہے۔ وہ نکلنے کے بعد بے کار ہو جاتے ہیں، کسی کام کے نہیں رہتے۔ آج کتنے بڑے بڑے مدرسوں کے فارغ ہیں کہ ان بے چاروں کو ڈھونڈنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ شناخت بدل جاتی ہے، کیفیت بدل جاتی ہے اور یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کارخانے میں انھوں نے سیکھا نہیں۔ اس کی بات مانی نہیں، اپنی من مانی کرتے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نکال دیا اور بعض لوگوں کا یہ ہوتا ہے کہ ان کو پیسہ تو بہت مل رہا ہے اور کما بھی خوب رہے ہیں، ان کی تنخواہ ایک لاکھ روپیہ مہینہ ہے، لیکن وہ بھی کمرے میں آ کر کہتے ہیں دعا فرما دیجیے، سکون نہیں ہے، دل اتنا بے چین ہے اور اندر سے اتنی پریشانی ہے کہ یہ لاکھ روپے بھی آپ لے لیجیے، لیکن سکون کی ایک گولی دے دیجیے۔

فارغین مدارس کی بڑی غلطی

اس میں بھی معاملہ وہی ہے کہ یہاں انھوں نے حاصل تو کیا، لیکن جو کام کرنا چاہیے تھا وہ اٹھا کر رکھ دیا۔ جیسے کہ محاورہ ہے: ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کا کھیل''۔ پڑھا تھا یہاں مدرسے میں، عربی پڑھی تھی اور علوم سیکھے تھے، مفتی بننا چاہیے تھا، محدث بننا چاہیے تھا، مقرر بننا چاہیے تھا، داعی بننا چاہیے تھا اور اللہ کا نیک بندہ بننا چاہیے تھا، لیکن کیا بن گئے؟ پیسوں کی تھیلی بن گئے، سائیکل رکشا، موٹر چلانے والے بن گئے۔ تو ظاہر ہے آپ ہی نے تو غلط کام کیا۔ کیا سیکھا تھا اور کیا کر رہے ہیں؟ جیسے کوئی کچھ خاص کام سیکھے اور اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ جائے تو کیا انجام ہوگا؟ در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا اور آخر میں جھک مار کر ادھر ہی آئے گا۔ نہیں آئے گا تو پھر دھکے کھائے گا۔ یہی حال ہمارے فارغین کا ہو گیا ہے۔ یہ فارغین جو مارے مارے پھر رہے ہیں، چاہے جتنا بھی

کمار ہے ہوں، خدا کے کارخانے سے وہ نکالے گئے ہیں، خدا نے انہیں پسند نہیں کیا، ادھر ادھر کے کام میں لگے ہیں۔ جو قرآن وحدیث اچھی طرح سیکھیں اور اس کے بعد جا کر ادھر ادھر کے کاموں میں لگ جائیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو گویا نکال دیا ہے۔ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ وہ قرآن وحدیث پڑھائیں اور قرآن وحدیث پر عمل کریں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا اور نکال دیا۔

شکر ادا کیجیے

اگر کوئی پڑھ رہا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے دو رکعت شکرانے کی پڑھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ توفیق عطا فرمائی۔ کیوں کہ ہم اس لائق نہیں تھے۔ تو اللہ تعالیٰ اس نعمت میں اضافہ فرمائے گا یعنی قرآن فہمی کی دولت ملے گی، حدیث پر عمل کرنے کی نعمت ملے گی، لوگوں میں عزت ملے گی، خدا کے یہاں مقبولیت ملے گی اور اخروی دنیا میں محبوبیت ملے گی لیکن اس کے لیے شکر ادا کرنا پڑے گا۔

ناشکری سے بچیے

اگر دل میں یہ خیال رہا کہ ہم کیوں پڑھا رہے ہیں مدرسے میں؟ یا کیوں پڑھ رہے ہیں مدرسے میں؟ تو یہ سب سے بڑی ناشکری ہے۔ جیسے ہمارے بہت سے طلبہ ہیں جن کے منہ میں پانی بھر آتا ہے کالج کے لڑکوں کو دیکھ کر اور ان کی پینٹ اور کوٹ دیکھ کر۔ وہ رشک کرتے ہیں کہ کاش ہم وہاں چلے جائیں، ظاہر ہے کہ ناشکری شروع ہوگئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے۔ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی دولت عطا فرمائی ہے اور دوسروں کو لالچ سے دیکھ رہے ہیں، تو آپ کو کیا ملے گا؟ یہیں سے بے برکتی شروع ہو جاتی ہے کہ آپ مجبوراً یہاں لائے گئے ہیں۔ آپ کو باندھ کر، پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے کہ آپ صبح وشام ہائے ہائے کر رہے ہیں اور ہائے ہائے کا نتیجہ یہ ہے کہ نقالی کرنے لگے ہیں۔ نقالی بھی ناشکری کی علامت ہے۔ ورنہ آدمی اپنے سے کم آدمی کی نقالی نہیں کرتا۔ جس کو اپنے سے

بڑا اور اچھا سمجھتا ہے اسی کو محبوب بناتا ہے اور نقالی اسی کی کرتا ہے۔ لیکن آپ ان کی نقالی کر رہے ہیں۔ اپنے آپ کو کم سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے پاس دولت کم ہے، ان کے پاس زیادہ ہے۔ حالاں کہ معاملہ برعکس ہے۔ آپ کے پاس زیادہ ہے ان کے پاس کم ہے۔ لیکن اپنی دولت پڑیا کے اندر ہے اور یہ پڑیا بند ہے، اس کو کھولیے تو آپ کا موتی دس کروڑ کا اور ان کی ساری دوکان جو موتیوں سے بھری پڑی ہے وہ بک جائے گی پانچ ہزار میں۔ کہاں ایک کروڑ اور کہاں پانچ ہزار؟ کوئی جوڑ ہے؟ لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب آپ شکر ادا کرنا شروع کریں گے۔ ورنہ آپ موتی کو پہچان ہی نہیں پائیں گے۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

آپ عظیم ترین دولت کے حامل ہیں

یہ دولت وراثت میں مل گئی اس لیے آپ قدر پہچانتے نہیں اور آپ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم عالم بننے جا رہے ہیں، آپ کے باپ دادا عالم تھے تو ان کی وجہ سے آپ یہاں آ گئے اور آپ یہ نہیں جانتے کہ آپ کو کتنی بڑی دولت مل گئی۔ یہ ٹائٹل جو آپ کے ابا سے دادا سے ملا اس کو پہچانتے نہیں۔ پتھر کتنا قیمتی ہے ہر آدمی نہیں پہچانتا۔ پتھر کے بارے میں ایک صاحب جو پتھر کا کام کرتے ہیں بتانے لگے کہ مولانا! بڑا دھوکا ہوتا ہے۔ ہم لوگ پتھر لے آتے ہیں، بعض بڑے قیمتی ہوتے ہیں، بعض پتھر بہت کم قیمتی ہوتے ہیں۔ ایک پتھر دس روپے کا ہے ایک پتھر دس ہزار کا ہے۔ جو لوگ نہیں پہچانتے ہیں وہ بڑا دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جب لوگ خریدنے آتے ہیں تو ہم لوگ دس والے کو دس ہزار کا بیچ دیتے ہیں۔ ان کو پتہ ہی نہیں، وہ جانتے ہی نہیں، پہچانتے ہی نہیں۔ تو پہچاننا ضروری ہوتا ہے اور اس کو شاہ پہچانتا ہے یا جوہری پہچانتا ہے۔ دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ کس قیمت کا پتھر ہے۔ آپ یہاں پڑھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کی دولت عطا فرمائی ہے، سنت کی دولت عطا فرمائی ہے تفقہ کی دولت عطا فرمائی ہے، عربی زبان کی دولت عطا فرمائی ہے اور بہ راہ راست ہم کلام رب ہو رہے ہیں۔ معمولی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو نازل کیا

ہے عربی زبان میں اس کلام سے ہم کلام ہیں، ہم اور آپ بہ راہ راست اس کو سمجھ رہے ہیں۔ یہ معمولی دولت نہیں ہے، اس پر ساری دولتیں قربان ہو جائیں، لیکن جب سمجھیں گے، تب اس کی قدر کریں گے۔ نہیں سمجھا تو یہ جو ہمارے فارغین ادھر ادھر چلے جاتے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے جانا ہی نہیں کہ ان کے پاس کیا ہے؟ آپ کی گدڑی میں کیا ہے؟ کیسا لعل ہے آپ نے جانا ہی نہیں۔ آپ تو سمجھے کہ ہم گدڑی پوش ہیں۔ گدڑی گدڑی ہے بس۔ کسی نے کہا جلدی سے اس کو اتار کر پھینک دو اور چلے جاؤ۔ آپ نے تو نکال کر پھینک دیا، جب کہ سارا مال اسی گدڑی میں تھا۔ گدڑی کا لعل اندر تھا۔ جس نے پالیا اس نے پایا لعل اور جا کر بازار میں بیچ دیا اور کروڑ پتی ہو گیا اور آپ لگے مارے مارے پھرنے اور اسی وقت آپ نے اس سے جس کے پاس گدڑی کا لعل پہنچ گیا تھا اس سے کہا کہ یہ رقم کہاں سے آئی کہ آپ اتنے بڑے مال دار ہو گئے؟ تو اس نے کہا کہ تم نے جو گدڑی پھینک دی تھی یہ اسی کا لعل ہے۔ اب بے چارے کف افسوس مل رہے ہیں، آہیں بھر رہے ہیں۔

اس سلسلے کا ایک عبرت ناک واقعہ

ہمارے حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ نے نزہۃ الخواطر میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک صاحب تھے سید زادے، سادات میں سے تھے، لیکن عادتیں بگڑ گئیں۔ شراب پینے لگے، غلط کاموں میں لگ گئے۔ اک دفعہ پی پلا کر پڑے تھے سڑک پر، اتنے میں دیکھا کہ ایک صاحب بڑے کروفر سے چلے آ رہے ہیں، گھوڑے پر سوار ہیں اور آگے پیچھے ان کے لوگ ہیں۔ کوئی گھوڑے کی لگام تھامے ہے، لوگ جھک جھک کر آداب بجالاتے ہیں، آگے پیچھے لوگ چلے آ رہے ہیں۔ اب سید صاحب کے دماغ میں آیا کہ میں سید ہوں، میں یہاں لڑکھڑا رہا ہوں اور یہ کون ہے؟ انھوں نے کہا: تم کون ہو؟ معلوم ہوا کہ ان کے دادا کے غلام کا بیٹا تھا جو اس مقام پر پہنچ گیا ہے اور اس کو جب معلوم ہوا کہ یہ شرابی ہمارے دادا کے آقا کا پوتا ہے تو وہ اتر کر ادب سے کھڑا ہو گیا اور اس کے سامنے سلام کیا تو انھوں نے کہا

کہ اچھا تو تو فلاں غلام کا لڑکا ہے؟ اتنے اونچے مقام پر پہنچ گیا؟ انھوں نے کہا کہ حضرت میں آپ سے کیا عرض کروں؟ میں نے آپ کے دادا کی اتباع کی اور میرے ابا اور دادا جو تھے، ان کی اتباع آپ نے کی۔ تو اب میں آپ کے دادا کے مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ یہ ہے گدڑی کا معاملہ کہ آپ نے اس کو گدڑی سمجھا اور گدڑی سمجھ کر چولا ہی بدل دیا تو کیا انجام ہوا۔ مارے مارے پھر رہے ہیں۔ آپ جائیے اور دیکھیے ہمارے اُن فارغین کا حال۔ آج ان کی نہ عقلیں ہیں، نہ ان کو سمجھ ہے کہ ان کو معلوم ہو کہ خدا نے ان کو کیسی بڑی دولت عطا فرمائی تھی۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ آپ کہاں آئے اور کہاں گئے؟ اور جب دیکھتے ہیں کہ فلاں تو اتنا اونچا ہو گیا تو للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ آپ ہی کی تو گدڑی ہے جسے آپ نے پھینک دیا تھا، میں نے اسے اٹھا لیا اور اندر مجھے لعل مل گیا۔

موتی بغیر سوراخ کے بے کار ہے

اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی چیز عطا فرمائی ہے، لیکن آنکھ کھول کر دیکھنا پڑے گا، عقل کے دروازے کھول کر سمجھنا پڑے گا اور اس کی قدر کرنی پڑے گی اور اس کی تراش خراش کرنی پڑے گی۔ دیکھیے موتی جو ہوتا ہے اس میں جب چھید کیا جاتا ہے تو اس کی قیمت اک دم آسمان تک پہنچ جاتی ہے، لیکن اس میں چھید کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بڑے بڑے ماہرین اس کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ اگر موتی میں چھید صحیح ہو جائے تو بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ آپ کو قرآن مل گیا یعنی موتی مل گیا۔ تو اب آپ اس میں چھید کیسے کریں گے؟ قرآن اپنی جگہ ہے تو بڑا قیمتی لیکن جب اس میں چھید کیا جاتا ہے تو اک دم سے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لیے بڑے بڑے لوگ بلائے جاتے ہیں۔ یہ اساتذہ اسی لیے تو لائے جاتے ہیں کہ اس موتی میں چھید کریں اور آپ کو دے دیں تا کہ اس کی قیمت اک دم سے بڑھ جائے اور آسمان تک پہنچ جائے۔ آپ یہاں سے جائیں تو بن جائیں۔ اس کے لیے تراش خراش کرنی پڑتی ہے اور اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص جس کے لیے یہاں آیا ہے وہی کام نہ کرے، دوسرے کام میں لگا رہے تو کیا ہوگا؟

سرمایۂ حیات گھلا جا رہا ہے

کلیلہ ودمنہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں موتی آ گیا۔ اس نے سوچا کہ اس میں چھید کرانے کے لیے کسی ماہر کاری گر کو بلایا جائے۔ ایک بہت بڑے ماہر کاری گر کو بلا کر لایا اور کہا کہ دن بھر تم موتی میں چھید کرنا اور شام کو ہم تم کو بہت کچھ دیں گے۔ اس نے کہا بہت اچھا اور جب وہ آیا تو اس سے پوچھا بھائی تم کہاں رہتے ہو؟ اس نے کہا فلاں جگہ۔ کرتے کیا ہو؟ کہا یہی موتی میں چھید کرتا ہوں اور ہاں گاتا بھی ہوں۔ اسے گانے کا بھی شوق تھا۔ اس نے کہا کچھ سناؤ جب سنا تو مست ہو گئے۔ کہا ایک اور سناؤ۔ اس نے اور سنایا۔ پھر باتیں کرنے لگے، پھر اس نے کہا اور سناؤ۔ اتنا مزہ آ گیا کہ دن بھر غزل ہی سنتے رہے۔ جب شام ہوئی تو اس نے کہا پیسے لائیے۔ کہا کیسے پیسے؟ جواب دیا موتی میں چھید کرنے کے پیسے۔ تو اس نے کہا وہ تو آپ نے کیا ہی نہیں۔ کہا اس سے کیا مطلب؟ آپ دن بھر مجھے روکے رہے اور مجھ سے کام لیتے رہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم میرے پیسے دو۔ آپ کو دینے پڑیں گے موتی میں چھید ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ میں تو اپنے وقت کا ذمے دار ہوں۔ جتنا وقت میں لے کر آیا تھا مجھے تو اس کے پیسے چاہییں۔ ایسا ہی معاملہ خدانہ خواستہ آپ کا نہ ہو۔

آپ یہاں آئے ہیں علم کے لیے تو آپ کو استادوں سے صرف یہی سیکھنا چاہیے تاکہ آپ کا موتی قیمتی ہو جائے اور چار چاند لگ جائیں، لیکن آپ نے استاد کو دھوکا دیا۔ حاضری بولی اور پیچھے سے نکل گئے۔ کتنے طلبہ ہیں لبیک والے؟ لب ہلائے اور بیک ہو گئے۔ تو انجام کیا ہوگا؟ وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے استاد کو دھوکا دیا۔ جب کہ استاد کو دھوکا نہیں دیا، اپنے آپ کو دھوکا دیا۔ کچھ طلبہ آتے ہیں جو الٹی سیدھی چیزیں پڑھتے ہیں۔ اگر محنت سے پڑھو گے، ادب کے ساتھ پڑھو گے تو جو تم کو اللہ تعالیٰ نے یہ دولت دی ہے وہ چمک اٹھے گی اور ایسا نفع ملے گا جس کا اندازہ تم کو نہیں ہے کہ تم کیا سے کیا ہو جاؤ گے۔ دیکھنے میں تو معمولی سے انسان ہو۔ لیکن جب یہی انسان عالم ہو جاتا ہے تو اس میں چار چاند لگ

جاتے ہیں، جس کو کہتے ہیں ملا۔ جس سے آپ گھبراتے ہیں۔ اگر کوئی کہہ دے ملا تو مولوی صاحب گھبرا جاتے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ پرانے زمانے میں ملا کہتے تھے علامہ کو۔ پہلے آدمی ملا بنتا ہے، پھر وہ مولوی بنتا ہے، پھر مولانا بنتا ہے، پھر امام بنتا ہے، پھر محبوب خالق بنتا ہے، پھر محبوب خاص وعام بنتا ہے اور جو محنت نہیں کرتے ہیں تو ان کا معاملہ برعکس ہے۔

خود کو زکوٰۃ کے مال سے بچایئے

زکوٰۃ دراصل زکوٰۃ دینے والے کا میل ہے۔ اب اگر کوئی شخص زکوٰۃ کھائے گا تو میل اس کے اندر آجائے گا۔ یہ زکوٰۃ جو آتی ہے مدرسے میں، بچے کھاتے ہیں، بہ ہر حال زکوٰۃ میل تو ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں؟ لیکن ہاں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ دیکھیے! زکوٰۃ جو ہے وہ زکوٰۃ دینے والے کو پاک کرتی ہے اور جس کو دی جارہی ہے اگر وہ محتاج ہے تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ تو یہ احتیاج اور فقر فلٹر کی مشین ہے۔ لیکن اگر کوئی زکوٰۃ کا حق دار نہیں ہے اور پھر بھی زکوٰۃ لے رہا ہے تو مشین ہی نہیں ہے اس کے پاس تو زکوٰۃ کا میل اس کے اندر ڈائرکٹ چلا جاتا ہے۔

حرام مال کے اثرات زائل کرنے کا طریقہ

دیکھیے! یہ کھال بدلتی رہتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی موسم میں اوپر کی کھال نکلنے لگتی ہے اور نیچے سے نئی کھال نکل آتی ہے اور اندر بھی خون نیا بنتا رہتا ہے، پرانا ختم ہوتا رہتا ہے۔ ہر چیز کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ بات رکھی ہے۔ تو بہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ رکھا ہے کہ حرام مال چلا گیا تو اب فوراً حلال مال کھایئے اور توبہ کرتے رہیے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اوور ہالنگ ہوتی رہے گی۔ حرام مال نکل جائے اور حلال مال اس کی جگہ پر آجائے گا اور آپ چمک اٹھیں گے جیسے کڑوی چیز آپ نے کھالی تو کڑوی چیز کے بعد جب آپ میٹھی چیز کھانا شروع کریں گے تو کڑوی چیز کا مزہ جاتا رہتا ہے حتیٰ کہ ختم ہوجاتا ہے۔ اچھائی برائی کو ختم کردیتی ہے اور اگر الٹا کیا کہ پہلے اچھا کھایا پھر برا کھایا تو ظاہر ہے کہ معاملہ بھی الٹا ہوجائے گا۔

ایک پامال سنت

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے:
"فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم إن لم یؤمنوا بھذا الحدیث اَسَفاً"
(اگر یہ لوگ اس کلام پر ایمان نہ لائیں گے تو گویا آپ غم کے مارے خود کو ان کے پیچھے ہلاک کر ڈالیں گے)۔ قرآن مجید میں اس طرح کی کئی آیتیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کی فکر اور اس کے لیے درد و بے قراری ایک مستقل سنت ہے۔ افسوس! کہ لوگوں کو اس سنت کا بالکل دھیان ہی نہیں ہے۔

اللہ کے محبوب بندوں سے محبت

اللہ سے محبت ہوگی تو اس کے رسولوں اور پیغمبروں سے بھی ہوگی اور خاص طور سے حضرت خاتم الانبیاء محبوب رب العالمین حضرت محمد ﷺ سے ہوگی اور جب اللہ کے رسول ﷺ سے محبت ہوگی تو آپ کے گھر والوں سے اور آپ کے صحابہ سے بھی ہوگی۔

اسی طرح جب اللہ سے محبت ہوگی اور اس کے رسول سے ہوگی تو اللہ والوں سے اور اولیاء اللہ سے بھی ہوگی۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے پوری امت کو خبردار کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کے چاہنے والوں کو بھی چاہو، ان کا خیال رکھو ان کی رعایت کرو اور ان کو ستانے یا ایذاء پہنچانے اور تکلیف دینے سے بچو۔ ورنہ اللہ کی پکڑ آجائے گی۔

دو لوگوں سے اعلان جنگ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے میں نے اس سے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ قرآن و حدیث میں جہاں تک دیکھا گیا ہے صرف دو چیزوں کے بارے میں اعلان جنگ ہے۔ ایک سود خور یعنی سودی لین دین کرنے والے کے بارے میں فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے جنگ کا اعلان فرمایا۔ اسی لیے جو لوگ سود لیتے

ہیں یا سودی کاروبار میں لگ جاتے ہیں ان کو تباہ ہونا لازمی ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کا، اس لیے کہ مسلمانوں کے لیے تو بالکل حرام ہے۔ جب مسلمان اس کاروبار میں آتا ہے تو تباہی و بربادی ساتھ لاتا ہے۔ ایسے ہی اللہ کے جو مقبول اور نیک بندے ہوتے ہیں، جو ان سے دشمنی رکھتا اور ان کی شان میں گستاخی کرتا ہے اور بے ادبی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ بندہ جب اللہ سے محبت کرتا ہے تو حقیقتاً وہ اللہ کی محبت کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ یہ محبت کا لازمہ ہے کہ محبت ایک طرف نہیں رہتی۔ اگر کوئی کسی سے محبت کرے تو اس کو بھی ہو جاتی ہے۔ اگر یک طرفہ محبت ہے تو کچھ دنوں تک تو معلوم ہوگا کہ یک طرفہ ہے لیکن پھر دوسری طرف بھی ہو جاتی ہے۔

اگر محبت کرنے والا صاحب حقیقت ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا ہے کہ اگر کوئی اس کے محبوب کو ستائے گا یا بری نگاہ سے دیکھے گا تو ہم نمٹ لیں گے۔ اس سے کہیں بڑھ کر معاملہ اللہ کے نیک بندوں کا ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہوتے ہیں، اب اگر کوئی شخص ان کو تکلیف پہنچائے، تو اللہ تعالیٰ اس کی پکڑ کر لیتا ہے۔

دو عبرت ناک واقعات

ایک صاحب حال بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کو کسی نے تکلیف پہنچائی۔ انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ اس کو ایک ہاتھ مارو۔ اس نے مارنے میں دیر کی اور وہ مر گیا۔ انھوں نے فرمایا: بھائی دیکھو! اگر ہم بدلہ لے لیتے تو وہ اللہ کی پکڑ سے بچ جاتا۔ اس لیے ہم نے کہا کہ مارو، تاکہ ہم بدلہ لے لیں اور یہ بچ جائے۔ تم نے مارنے میں دیر کی تو اوپر سے اس کی پکڑ آ گئی اور مارا گیا۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک صاحب ایک صحابی کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور وہ خاموش سن رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے جواب دینا شروع کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک تم خاموش تھے، فرشتہ تمھاری طرف سے جواب دے رہا تھا۔ جب تم نے جواب دینا شروع کر دیا تو وہ چلا گیا۔

غضب الٰہی کا انجام

اللہ کے نیک بندوں کو ستانے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔کبھی بیماری میں ڈال دیا جاتا ہے، کسی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔گھر میں انتشار ہو جاتا ہے۔کتنے اس طرح کے معاملات ہوتے رہتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کو زیغ وضلال اور گم راہی میں مبتلا کر دیا جائے۔

ایک حکم الٰہی

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے آداب اللہ نے خود قرآن مجید میں بیان کر دیے، تاکہ امت کا کوئی فرد بے ادبی کا مرتکب ہو کر جہنم میں نہ چلا جائے۔یہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور آپ ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا نتیجہ ہے۔انھیں میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ جس کو قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے: لا ترفعوا أصواتكم فوق صوت النبي. یہ منع کیا گیا کہ نبی پاک ﷺ کی مجلس میں آؤ تو تمہاری آواز بلند نہیں ہونی چاہیے۔کیوں؟ اس لیے کہ بعض دفعہ جب آواز بلند ہوتی ہے تو دل کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ ہر آواز سے دل نہیں دکھتا، نہ تکلیف پہنچتی ہے۔ہاں بعض دفعہ تیز آواز ایسی ہوتی ہے جس سے تکلیف پہنچتی ہے۔اسی لیے فرمایا: وانتم لاتشعرون لیکن تم تمیز نہیں کر سکتے ہو کہ تمھاری آواز سے تکلیف پہنچی یا نہیں پہنچی۔تو جب تم کو نہیں معلوم تو آواز بلند ہونی ہی نہیں چاہیے۔یہ ادب بیان کیا گیا ہے رسول پاک کی مجلس کا اور جو اللہ کے محبوب ہیں اور رسول کے نائب اور جانشین ہیں ان کے ساتھ بھی احتیاط کرنی چاہیے کہ کوئی ایسا فعل، ایسا کام جس سے ان کو تکلیف پہنچ جائے، نہیں کرنا چاہیے۔

ولی اللہ بننے کا طریقہ

ولی بننے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو فرائض کی پوری پابندی کرے، جس کو ڈیوٹی کہتے ہیں۔ڈیوٹی کی پابندی کرے تو زندگی سکون سے گزرے گی۔اگر فرائض کی پابندی

کرتا ہے عبادات میں بھی، معاملات میں بھی، حقوق کی ادائیگی میں بھی تو اس کو عام پرسکون زندگی حاصل ہوجاتی ہے۔ نہ اس میں فخر وغرور کی بو ہوتی ہے اور نہ کوتاہی و نقص کی بے چینی۔ نہ تو خود وہ اپنے کو بزرگ سمجھتا ہے اور نہ ہی اس کو دوسرے بزرگ مانتے ہیں۔ لیکن اگر وہ حوصلہ مند ہے، باہمت ہے اور آگے بڑھنے کا شوق ہے تو وہ اس کے ساتھ نوافل پڑھنے کی پابندی کرتا ہے تو اس کے اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں۔ اب اگر وہ خود فریبی، فخر وغرور میں اپنے کو بڑا بزرگ سمجھنے کے خیال فاسد سے بچا رہتا ہے تو وہ اللہ کا ولی بن جاتا ہے اور اس کی ترقی کی انتہا نہیں ہوتی۔

ایک انسانی کم زوری

انسان کی یہ کم زوری ہے کہ وہ فرائض میں تو کوتاہی کرتا ہے اور نوافل کی بڑی پابندی۔ بل کہ مزید وظائف بھی اپنے سر لے لیتا ہے۔ جس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ دفتروں اور کارخانوں میں کام کرنے والے اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی کرتے ہیں، دیر سے آتے ہیں، جلدی چلے جاتے ہیں یا دفتر ہی میں بیٹھ کر وقت ضائع کرتے اور کارخانے کا نقصان کرتے ہیں۔ لیکن وہی لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اوور ٹائم (Over Time) مل جائے۔ فرض تو پورا نہیں کرتے، اوور ٹائم کے چکر میں رہتے ہیں۔ آج دین میں بھی یہی ہورہا ہے کہ فرائض کو تو پورا نہیں کررہے ہیں۔ لیکن اوور ٹائم کے چکر میں رہتے ہیں۔ پوچھتے ہیں فلاں کام نہیں ہورہا ہے وظیفہ بتادیجیے۔ وظیفہ پڑھ رہے ہیں دو دو گھنٹے اور فرض نماز غائب۔ یا اس طرح جو فرض چیزیں ہیں، لازمی ہیں، ماں باپ کے حقوق ہیں، کمانا فرض ہے، وہ نہیں کریں گے۔ نفل نمازیں پڑھتے چلے جارہے ہیں۔ فرض کے تارک ہیں اور نوافل پر عمل ہورہا ہے۔ یہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ پہلے ڈیوٹی کرو، ڈیوٹی پوری ہوگئی، اب اوور ٹائم کرو تو ٹھیک ہے۔ تو ڈیوٹی پوری کرنے کے بعد فرائض کی ادائیگی کے بعد، اگر کوئی شخص نفلی کام کرتا ہے تو پھر اس کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں۔ کیوں کہ فرض جب پورا کرے گا تو کارخانے کا مالک خوش ہوجائے گا۔ وہی اس کو وہاں اوور ٹائم بھی دے گا اور جو وہاں گڑبڑ کررہا ہے،

فرض پورا نہیں کرتا، ڈیوٹی پوری نہیں کرتا تو اس کو اوور ٹائم بھی نہیں ملے گا اور نظر رکھے گا کہ یہ آدمی صحیح نہیں ہے۔

اولیاء کی پہچان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بندہ نوافل کے ذریعے مجھ سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس کو چاہنے لگتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے۔ آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے۔ ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے۔ پیر بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔ مجھ سے مانگتا ہے تو میں دیتا ہوں اور پناہ چاہتا ہے تو ضرور پناہ دیتا ہوں۔ یہ علامتیں بتائی گئیں۔ اسی سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اولیاء اللہ محفوظ ہوتے ہیں، انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں۔ اولیاء کرام محفوظ ہوتے ہیں، یعنی جب اللہ تعالیٰ کان بن جائے اور ہاتھ بن جائے، پیر بن جائے تو اس کا کان غلط بات نہیں سنتا، آنکھ غلط نہیں دیکھتی، پیر غلط نہیں اٹھتا، ہاتھ غلط نہیں پکڑتا اور اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اگر پناہ مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پناہ دیتا ہے۔ محفوظ ہونے کا یہی مطلب ہے، یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ یعنی اس میں گناہ کا امکان ہوتا ہے، بل کہ گناہ ہو بھی جاتا ہے لیکن گناہ پر برقرار نہیں رہتا ہے۔ اس پر اصرار نہیں کرتا۔ فرق یہ ہے کہ ہم جیسے لوگ گناہ کرتے ہیں تو کرتے چلے جاتے ہیں۔ توبہ نہیں کرتے۔ صحیح راستے پر آنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس راستے میں محنت و مجاہدہ نہیں کرتے۔

سنت کو محدود مت کیجیے

اتباع سنت کو بھی لوگوں نے محدود کر دیا۔ اکثر لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہتے ہیں سنت ہے کہ داڑھی ایک مشت ہو جائے اور ٹخنے سے اوپر پائے جامہ، بس ختم۔ بھائی! اتباع سنت کا مطلب ظاہری اور باطنی دونوں سنتوں پر عمل کرنا ہے۔ جیسے کبوتر کے دونوں پر کاٹ دیے جائیں تو صرف اڑ نہیں پائے گا۔ لیکن کبوتر کے اندر جان ہی نہیں تو وہ چاہے کتنا

ہی خوب صورت کیوں نہ ہو، کیسے ہی پر کیوں نہ ہوں، کوئی فائدہ نہیں۔ جن کے اندر باطنی سنت نہیں ہے تو اس کے بغیر کچھ نہیں ہونے والا۔ ظاہری طور پر دیکھے گئے کہ یہ بڑے متبع سنت ہیں اور دل میں گندگی بھری ہوئی ہے۔ جب تک ہمارا باطن ٹھیک نہیں ہوگا اور باطن کی سنتوں پر عمل نہیں کریں گے، تب تک ہمارے اندر وہ چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔

مولانا علی میاں کی مثال

ہمارے حضرت مولانا دیکھنے میں بڑے سادہ تھے مگر وہ ظاہری اور باطنی دونوں سنتوں پر عمل کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اندر کا نور باہر پھوٹ کر آ گیا ہے۔ ایک بار ندوے میں بڑا اجلاس ہوا۔ ہندستان کے بڑے بڑے علماء اور مشائخ آئے تھے۔ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی آیا اور اس نے پوچھا: مولانا علی میاں صاحب سے ملنا ہے۔ لوگوں نے کہا: جانتے ہو؟ کہا: پہچانتے تو نہیں۔ لوگوں نے اس کا امتحان لیا۔ مولانا سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس بڑے بڑے مشائخ اور علماء تشریف فرما تھے۔ اپنے اپنے لباس میں ملبوس حضرت مولانا ویسے ہی سادہ انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں نے کہا ان ہی میں سے ایک ہیں، پہچان لو۔ وہ سیدھا مولانا کے پاس گیا اور ان سے مصافحہ کر کے آ گیا۔ لوگوں نے پوچھا: کیسے پہچانا؟ تو وہ کہنے لگا کہ چہرہ بتا رہا تھا۔ تو جو اندر کی سنتیں ہوتی ہیں ان کی اتباع سے نور پھوٹ کر باہر آتا ہے۔ حضرت مولانا نے پوری زندگی اپنے آپ کو چھپانے کی اتنی کوشش کی لیکن انتقال ہوا تو محسوس ہوا کہ ایک ڈھکن تھا جو کھل گیا اور خوش بو باہر پھیل گئی۔ نہا دھو کر، شیروانی پہن کر، عطر لگا کر، رمضان المبارک کے مہینے میں، جمعہ کے دن دربار خداوندی میں حاضر ہوئے اور سورۂ یٰس پڑھتے ہوئے دنیا سے تشریف لے گئے۔ انتقال کے بعد قبر سے چھ مہینے تک خوش بو آتی تھی۔ قبر سے نکل کر پوری مسجد اور اطراف میں پھیل جاتی تھی۔ آج بھی حضرت مولانا کی کتابوں میں تاثیر ہے۔

متبعین سنت کو پہچانیے

انسان کو متبع سنت انسان کی صحبت میں رہنا چاہیے اور اسے ڈھونڈنے کی کوشش میں رہنا چاہیے۔ اکثر لوگ الٹے سیدھے لوگوں کے جال میں آ کر پھنستے ہیں اور بعد میں آ کر روتے ہیں۔ بھائی آپ ایسا کام کیوں کرتے ہیں کہ بعد میں سجدۂ سہو کرنا پڑے۔ اس لیے آپ چیک کیجیے کہ متبع سنت کون ہے؟ آپ ان کی صحبت میں بیٹھیے۔ زبان کیسی ہے؟ اس کا رہن سہن کیسا ہے؟ اس کا عزیزوں کے ساتھ معاملہ کیسا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ایک اور چیز بھی دیکھنا چاہیے جو حدیث سے بھی ثابت ہے کہ اس کا رشتے داروں سے معاملہ کیا ہے؟ اس لیے کہ رشتے داروں سے معاملہ کرنا بڑے دل جگر کی بات ہے اور اس میں جو کام یاب ہے وہ سب سے زیادہ متبع سنت ہے۔ حضرت مولانا (علی میاں) اس معاملے میں غیر معمولی مقام رکھتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے بھائی کو یہ مقام عطا فرمایا تھا۔ جو جتنا زیادہ قریبی رشتے دار ہوتا، اس کا اتنا ہی زیادہ خیال رکھتے تھے۔ حضرت مولانا کے ایک رشتے دار تھے، مولانا کے عصبات میں سے تھے۔ عصبہ کہتے ہیں باپ کے رشتے دار کو۔ ان کا رشتہ شریعت میں بڑھا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ ان کے پائے جامے میں پاخانہ ہو گیا تو حضرت مولانا نے کہا کہ میں صاف کروں گا۔ لوگوں نے کہا آپ نہ کریے، تو حضرت نے فرمایا: یہ میرے قریب کے رشتے دار ہیں، مجھ پر زیادہ حق ہے۔

جوانی دیکھیے، بڑھاپا نہیں

ہمارے حضرت مولانا (علی میاں) نے بارہ بارہ پندرہ پندرہ کلومیٹر سائیکل سے سفر کیا ہے۔ یہ کوئی سوچ سکتا ہے؟ جن کے لیے ہمیشہ جہاز کھڑا ہو، وہ سائیکل سے اتنا سفر کرتا ہوگا؟ تو ہمیں ان حضرات کی جوانی کو دیکھنا چاہیے اور سبق لینا چاہیے۔ لیکن لوگ جوانی نہیں دیکھتے، صرف بڑھاپا دیکھتے ہیں۔ پھر بڑھاپے کی ہی نقل کرنے لگتے ہیں اور خود کو جوانی میں بوڑھا بنا لیتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔

تاثیر صحبت کے کچھ واقعات

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی جب چھوٹے تھے، تقریباً چار سال کے تو حضرت سید احمد شہید اس علاقے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت ان کو حضرت سید صاحب کی گود میں دیا گیا اور سید صاحب نے تبرکاً بیعت بھی فرمالیا۔ اس کے اثرات دیکھیے کہ پھر حاجی صاحب، حاجی صاحب بن گئے۔ کیوں کہ سید صاحب کے پاس ان کے شیخ میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی اور ان کے شیخ شاہ عبدالرحیم ولایتی جو سید صاحب کے خلیفہ تھے رہے۔ جب حاجی صاحب نے ان کی صحبت اختیار کی تو اللہ نے ان کو وہ صلاحیت عطا فرمائی کہ مولانا تھانوی سے کسی نے پوچھا: حضرت حاجی صاحب تو آپ سے علم میں کم ہیں لیکن آپ ان کے پاس ہر وقت جانا چاہتے ہیں؟ تو فرمایا: ہاں ہم جانا چاہتے ہیں اور حاجی صاحب پہنچادیتے ہیں۔ یہ فرق ہے۔ اس لیے ان کے پاس جاتے ہیں۔

ایسے ہی ایک مرتبہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اپنی مسجد میں تشریف لائے تو ایک دیہاتی آدمی وضو کررہا تھا۔ مولانا نے اس کو دیکھا تو بعض مریدین سے کہا کہ جب یہ وضو کرچکیں تو ان کو مجھ سے ملادینا۔ نماز ہوگئی، نماز کے بعد ان کو بلایا اور پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو؟ کہا: کچھ نہیں، کھیتی کسانی کرتا ہوں، اللہ اللہ کرتا ہوں۔ کہا: نہیں، کچھ اور بتاؤ۔ اللہ اللہ کے اثرات کو میں سمجھتا ہوں کہ کیسے پڑتے ہیں۔ نماز پڑھنے کے اثرات کو بھی جانتا ہوں۔ لیکن تمھارے اندر کچھ اور بات ہے۔ کیا کوئی واقعہ تمھارے ساتھ پیش آیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ حضرت سید احمد شہید ہمارے علاقے میں آئے ہوئے تھے۔ میں چھوٹا سا تھا، میں لوگوں کے بیچ سے نکلتا ہوا ان کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا، ان کی نظر مجھ پر پڑرہی تھی۔ مولانا گنگوہی نے فرمایا: بات سمجھ میں آگئی۔ اسی کا اثر ہے کہ تمہارے اندر سے ایک نور نکل رہا ہے، جو آسمان تک جارہا ہے۔ تو آدمی جتنا قوی ہوگا اتنے ہی اثرات پڑتے ہیں۔

اب وہ دیہاتی تھے، لیکن سنت پر ایسے کاربند تھے کہ کوئی سنت ان سے نہیں چھوٹتی

تھی۔حضرت سید صاحب کے اثرات میں سے خاص اثر یہ تھا کہ جو بھی ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا تھا اس کی کایا پلٹ جاتی تھی۔اس شخص کی قلب ماہیت ہو جاتی تھی۔یہ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔یہ سب جانتے ہیں کہ یہ نظر بد ہے۔بچوں کو نظر لگتی ہے۔"العین حق"۔حدیث میں ہے کہ بعض لوگوں کی نظر اتنی بری ہوتی ہے کہ صحیح وتن درست کو دیکھ لیں تو وہ بیمار ہو جائے اور لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق بھی ہو جاتا ہے۔اسی طرح جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں ان کی نظر میں قلب ماہیت کی صلاحیت ہوتی ہے۔

نسبت کیا ہے؟

بعض دفعہ ایسی نظر ہوتی ہے کہ ایک ہی نظر میں کام ہو جاتا ہے۔نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پھر آدمی ادھر ادھر نہیں بھٹکتا ہے۔ مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی نے اس کو سمجھانے کے لیے کہا ہے:

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی کو چھوڑ کے جانے نہ پایئے

اس کو بہت آسانی سے سمجھا دیا۔نسبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ آدمی بھاگنا نہ چاہے۔ بھاگنا چاہے گا لیکن ایسے اسباب پیدا ہو جائیں گے کہ بھاگ نہیں پائے گا۔اسی کا نام ہے نسبت۔جب اللہ والوں کے پاس رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرتا ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے۔اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے۔پیر بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔مانگتا ہے تو دیتا ہوں۔ پناہ چاہتا ہے تو پناہ دیتا ہوں۔اسی لیے ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ اولیاء محفوظ ہوتے ہیں اور محفوظ کا مطلب بعض لوگ غلط سمجھ لیتے ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ گناہ نہیں ہوتا۔نہیں، گناہ تو ہو جاتے ہیں لیکن گناہ پر باقی نہیں رہتے، اصرار نہیں کرتے، توبہ کی توفیق مل جاتی ہے۔معصوم صرف انبیاء کی ذات ہے اور کوئی نہیں۔ جب آدمی نیک لوگوں کی صحبت میں رہے گا تو یہ چیز اس کو حاصل ہو جائے گی۔اب جس وقت بھی حاصل ہو جائے۔

بعض دفعہ کئی کئی سال رہنا ہوتا ہے، کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بعض دفعہ چند لمحوں کے لیے آئے اور کام بن گیا۔

مولانا کرامت علی جون پوری کی کرامت

حضرت مولانا کرامت علی جون پوری جن سے اللہ تعالیٰ نے بنگال میں غیر معمولی کام لیا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ پر ایک کروڑ لوگ ایمان لائے تھے۔ پہلے بنگلہ دیش میں مسلمان اقلیت میں تھے، اب اکثریت میں ہیں۔ یہ سب مولانا کرامت علی کی کرامت ہے۔ ان کا نام علی تھا مگر ان سے کرامتوں کا اتنا ظہور ہوا کہ کرامت کا لفظ ان کے نام کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ اسی لیے وہ خود خط کے اخیر میں لکھتے تھے: علی ملقب بہ کرامت علی۔ اسی جگہ جہاں آپ لوگ بیٹھے ہیں، تکیہ پر وہ آئے تھے اور حضرت سید صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔ سید صاحب نے ۱۸ دن کے بعد فرمایا کہ مولانا کام ہوگیا۔ اگر آپ رکنا چاہیں تو رک سکتے ہیں لیکن اب آپ کے رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صحبت کی جو برکتیں تھیں وہ ۱۸ دن میں حاصل ہوگئی تھیں اور اتنے کامل ہوگئے تھے کہ سید صاحب نے ۱۸ دن میں فرمایا تھا کہ مولانا آپ جایئے اور بنگال میں کام کیجیے۔ پھر مولانا کچھ دن اپنے شوق سے ٹھہرے۔ اس کے بعد بنگال تشریف لے گئے۔ ۱۸ سال کے بعد اپنے گھر لوٹے، وہ نہ بنگال کے تھے اور نہ بنگلہ زبان جانتے تھے۔ پھر اٹھارہ سال کے بعد اپنے والد سے ملنے آئے اور پھر سب کو لے کر وہیں چلے گئے اور ۵۴ سال تک وہیں رہے اور پورا بنگال بدل کے رکھ دیا۔ اب یہ قوی صحبت کا اثر ہے کہ چند دن میں کام بن گیا۔ لیکن اس کے لیے آداب چاہییں۔ موانع نہیں ہونے چاہییں کہ حرام کھا رہے ہیں۔ ورنہ صحبت کا اثر کہاں ہوگا؟ اور غیبت کر رہے ہیں تو صحبت کا اثر کیا ہوگا؟ محبت کے ساتھ، اخلاص کے ساتھ، عظمت کے ساتھ اگر آدمی رہے تو فائدہ ہوتا ہے، ورنہ اگر ایک ہزار سال رہے تو بھی فائدہ نہیں ہوگا۔

آداب کا پاس ولحاظ ضروری ہے

حویلیوں، کوٹھیوں اور محلات کے تالے اور کنجیاں ہوتی ہیں۔اسی طرح ہر حویلی کے کچھ دروازے اور اس میں داخل ہونے کے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں۔ چناں چہ دروازے پر دستک دیے بغیر، آداب وروایات کو ملحوظ رکھے بغیر، کنجی اور تالے کے بغیر کیسے کوئی شخص محل میں داخل ہوکر اس میں موجود خزینوں اور دفینوں کو حاصل کرسکتا ہے؟ ان دفینوں میں ایسے بیش بہا خزانے ہیں جن کے ذریعے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی ساقی گری کرسکتا ہے۔اس کے دل کو قرار اور اس کی روح کو چین وسکون مل سکتا ہے۔قلب وجگر پرسکون اور مطمئن ہوسکتے ہیں۔

ربیع الاوّل کا مطلب موسم بہار

ماہ ربیع الاوّل ہر سال ایک حسین اور دل کش پیام لے کر آتا ہے اور انسانیت کے سامنے دہراتا ہے تاکہ انسانیت پر بہار آجائے۔ کیوں کہ موسم بہار سراپا فرحت و انبساط، شادمانی ومسرت اور نور وبرہان ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کس طرح ''موسم خزاں'' سے نجات پائی جائے۔جس میں انسان مایوسی کا شکار ہوجاتا ہے۔ پژمردگی اور اضمحلال کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔مسکراہٹیں ختم ہوجاتی ہیں۔اس کے چہرے پر افسردگی و سراسیمگی کا عالم طاری ہوجاتا ہے۔

ناز نہیں، نیاز

حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی کا یہ ملفوظ مجلس میں پڑھا گیا کہ ''کمالات پر ناز کس بات پر؟ یہ تو عطائے حق ہے۔اپنا کچھ کمال نہیں۔ہمیں ناز نہیں، نیاز کرنا چاہیے۔''

داعی اسلام نے اس ملفوظ کو مزید وسعت دیتے ہوئے فرمایا:

جب دینے والا سامنے ہوتا ہے تو ناز نہیں ہوتا۔سامنے نہیں ہوتا تو ناز ہوتا ہے۔تو جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ استحضار ہوتا ہے، وہ ہمیشہ نیاز کرتے ہیں، ناز کا خیال بھی نہیں آتا۔

محبت کی قسمیں

محبت دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک وہ جو آسمان سے آتی ہے اور یہی اصل ہے، جیسے بارش اوپر سے نازل ہوتی ہے اور زمین اس کو جذب کر لیتی ہے اور پھر اچھے سے اچھا سبز و شاداب غلہ، پھل، پھول اُگاتی ہے اور لوگ اُس سے مستفید ہوتے ہیں۔ دوسری محبت سیلاب کی طرح ہوتی ہے، جیسے سیلاب آتا ہے، پوری پوری ہری بھری بستیوں کو صاف کر دیتا ہے، پھر آخر میں کیچڑ ہی بچا رہ جاتا ہے۔ جیسے یہ کرکٹ والے اور فلمی دنیا کے لوگ جو دیکھنے میں بڑے اچھے لگتے ہیں اور بعد میں پیٹھ پیچھے روتے ہیں۔ جو ان کی اتباع کرتا ہے وہ بھی روتا ہے اور پھر وہی لوگ ان کو برا بھلا بھی کہتے ہیں۔

دلوں میں ہدایت موجود ہے

جس طرح سے لوہا زمین کے اندر ہوتا ہے، حالاں کہ وہ زمین میں پیدا نہیں ہوتا بل کہ اس کے ذرات اوپر سے اترتے ہیں، جیسا کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ کہ ہم نے لوہے کو اتارا ہے اور لوہا زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور ہم اسے اپنی تھوڑی سی محنت سے کھود کر نکال لیتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ہدایت لوگوں کے دلوں میں اتر چکی ہے۔ بس ہمیں ذرا سی محنت کی ضرورت ہے اور الحمد للہ اس کے نتائج بھی سامنے ہیں۔

نتائج کی فکر مت کیجیے

جو اللہ کے لیے کام کرتے ہیں، وہ کبھی نہیں تھکتے اور اس سے بھی نہیں گھبراتے کہ نتائج آرہے ہیں یا نہیں۔ کام ہمارے ذمے ہے، نتائج نہیں۔ نیت کو درست کر کے اخلاص کے ساتھ اللہ کے لیے آدمی کام کرے تو ان شاء اللہ کبھی تھکے گا نہیں اور اللہ کے یہاں قابل قبول بھی ہوگا۔

ہمارے حضرت مولانا علی میاں فرمایا کرتے تھے کہ آج لوگ بدنیت نہیں ہیں،

بل کہ بے نیت ہیں۔آج کل لوگ بڑے اچھے اچھے کام کر ڈالتے ہیں،لیکن ہم اگر اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی نیت ہی نہ تھی۔

تین البیلی کتابیں

مجلس میں کوئی کتاب پڑھی جارہی تھی۔اس میں لکھا تھا کہ تین کتابیں البیلی ہیں:

(۱) قرآن کریم (۲) بخاری شریف (۳) مثنوی مولانا روم

یہ تینوں ایک ہی صف میں لکھی تھیں۔مجلس میں بیٹھے لوگ آپس میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے،تو مولانا نے فرمایا: تین کتابیں البیلی اس اعتبار سے ہیں کہ آسمانی کتابوں میں قرآن کریم البیلی کتاب ہے۔انبیاء کے ارشادات میں بخاری شریف البیلی ہے اور بزرگوں کے ملفوظات میں مثنوی مولانا روم البیلی کتاب ہے۔

پھر یہ بھی فرمایا کہ تینوں کو ایک صف میں لکھنا ادب کے خلاف ہے۔البتہ تشریح سن کر لوگ مطمئن ہوگئے۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق

ایک مرتبہ مولانا ٹرین سے سفر کررہے تھے۔کچھ غیر مسلم حضرات آپس میں تبصرہ کررہے تھے کہ اسلام میں عورتوں کے حقوق نہیں ہیں۔مولانا سنتے رہے اور جب وہ حضرات چپ ہوگئے تو مسکراتے ہوئے فرمایا: اسلام میں عورتوں کے جو حقوق ہیں اگر آپ کی عورتوں کو معلوم ہوجائیں تو ساری عورتیں ہمارے یہاں آجائیں گی،تو پھر آپ کا کیا ہوگا؟ پھر کچھ حقوق پر گفتگو بھی کی،جس سے وہ غیر مسلم متاثر ہوئے۔

مشکلات کی مثال

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے دودھ کے بارے میں فرمایا ہے کہ ہم نے دودھ کو جو اتنی آسانی سے حلق میں اتر جانے والا ہے،اس کو گوبر اور خون کے درمیان سے نکالا ہے۔اسی طرح سے انسان کو تمام مسائل اور پریشانیوں سے گھرے ہونے کے باوجود اس

میں سے راستہ نکالنا چاہیے۔ مسائل اور پریشانیوں کے بیچ ہی سے راستہ نکلتا ہے۔ کبھی بھی گھبراہٹ میں کام نہیں چھوڑنا چاہیے۔

علم اور دودھ

علم کی دعا ہے: رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا، یعنی اے میرے رب! ہمارے علم میں اضافہ فرما اور دودھ پینے کے بعد کی دعا ہے: اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْہِ وَزِدْنَا مِنْہُ، یعنی اے ہمارے رب! اس میں برکت عطا فرما اور اضافہ فرما۔ ان ہی دونوں میں اضافے اور زیادتی کی دعا کی گئی ہے اور مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کسی اور چیز کے متعلق زیادتی کی دعا کی گئی ہے۔ کیوں کہ علم اور دودھ کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ جیسے جس برتن میں دودھ لیا جاتا ہے، وہ برتن الگ ہوتا ہے۔ اگر گوشت کے برتن میں آپ دودھ لے لیں گے تو دودھ پھٹ جائے گا، یا جس برتن میں آپ دودھ لے رہے ہیں اگر وہ برتن پیلا ہے تو دودھ پیلا نظر آئے گا، لال ہے تو لال نظر آئے گا، یعنی جس برتن میں دودھ لیا جائے گا، وہ اسی طرح سے ہو جائے گا، دودھ ویسا ہی نظر آئے۔ اس میں دودھ کی کمی نہیں ہے بل کہ برتن کی کمی ہے۔ اسی طرح سے علم دین حاصل کرنے والے کو تمام ظاہری و باطنی موانع سے بچتے ہوئے دینی علم حاصل کرنا چاہیے۔ پہلے اپنے برتن کو خوب مانجھ لے، یعنی نیت درست کر لے۔ پھر اللہ کی رضا کے لیے علم حاصل کرے۔

دل کا دروازہ کھٹکھٹایئے

دعوت کے کام کے لیے ضروری ہے دل کو جیتنا اور دل کو مطمئن کرنا اچھے اخلاق سے پیش آنا۔ نہ کہ صرف دماغ کو مطمئن کرنا۔ اگر آپ دل کو مطمئن کر لیں گے تو وہ خود آپ کا ہو جائے گا اور اگر اس کے دماغ کو مطمئن کرنے کے چکر میں پڑے تو سوالات و جوابات کا انبار لگ جائے گا اور پھر بعد میں دو چیزیں پیش آئیں گی۔ اگر وہ جیت گیا تو آپ نہیں ہاریں گے، اسلام ہارے گا اور اگر وہ ہارا تو آپ سے کترانے لگے گا اور ملے گا نہیں،

کٹ جائے گا۔اس لیے دل کے دروازے سے اندر داخل ہو جایئے اور پھر دماغ کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں کو کھول سکتے ہیں۔

توبہ اور صحبت صالح

ایک صاحب نے سوال کیا: میں بار بار توبہ کرتا ہوں، پھر بھی گناہ کر بیٹھتا ہوں، میں کیا کروں؟ پڑھانے کا بھی جی نہیں چاہتا۔داعی اسلام نے فرمایا: شیطان کتنا چالاک ہے۔پہلے تو گناہ کبیرہ کرواتا ہے، پھر بعد میں مایوس کر کے کفر تک پہنچا دیتا ہے۔مایوسی کفر ہے۔دیکھیے جیسے پورے بمبئی شہر اور اس کے اطراف بڑی بڑی فیکٹریوں کا کچرا سمندر کے کنارے ایک جگہ آ کر جمع ہو جاتا ہے لیکن سمندر کی ایک لہر پورے کچرے کو اس طرح صاف کر دیتی ہے گویا کہ وہاں کچھ تھا ہی نہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے آپ مایوس نہ ہوں۔بار بار توبہ کریں۔کسی اللہ والے سے تعلق قائم کریں اور اپنا حال دل بھی بتاتے رہیں۔

اللہ والے یا شیخ ڈاکٹر کے مانند ہوتے ہیں۔وہ باطنی امراض کا علاج کرتے ہیں۔تو اگر مریض معالج کو اپنا حال نہ بتائے تو علاج کیسے ہوگا؟ پورا حال کہتے رہیں اور مایوس نہ ہوں۔

مشاجرات صحابہ کی خوب صورت مثال

جیسے ایک محلے میں دو بچے آپس میں لڑ گئے۔ایک نے دوسرے کو پتھر اٹھا کر مار دیا اور اس کا سر پھوٹ گیا، تو دونوں بچوں کے گھر والے اپنے اپنے گھر سے نکل آئے اور لڑائی جھگڑا کر کے جیل چلے گئے۔دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ وہ دونوں بچے جو آپس میں لڑے تھے، دوسرے تیسرے دن ہی پھر آپس میں کھیلنے لگے۔ان کے چکر میں گھر والے تو جیل چلے گئے، لیکن بچے آپس میں پھر گھل مل گئے، کیوں کہ بچے معصوم ہوتے ہیں۔

اسی طرح صحابہ کرام کی جنگ معصومانہ جنگ تھی۔اب ان کے بعد جو اس مسئلے

میں تکرار کریں گے تو یہ ڈر ہے کہ ایمان سے خارج نہ ہو جائیں۔ اس کے لیے ہمارے سلف کا کمیشن بیٹھ چکا ہے۔ ان کی عدالت میں مقدمہ دائر ہو چکا اور وہ کا فیصلہ بھی سنا چکے ہیں۔

عقیدت و محبت کا فرق

عقیدت ختم ہو جاتی ہے، محبت اگر سچی ہے تو ختم نہیں ہوتی۔ کسی کے چمتکار کو دیکھ کر آدمی معتقد ہو جاتا ہے۔ اس سے اعلیٰ چمتکار کسی اور نے دکھا دیا تو وہ اس کا معتقد ہو جائے گا۔ لیکن محبت کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے۔

ذکر کے فوائد کی مثال

ایک صاحب نے شکایت کی کہ کیا کیا جائے؟ ذکر کا فائدہ محسوس نہیں ہوتا۔ مولانا نے فرمایا: آپ کھانا کھاتے ہیں تو کیا کبھی یہ محسوس ہوا کہ کھانے سے یہاں گوشت بن گیا؟ یہاں اُبھر آیا؟ یہاں پھول گیا؟ لیکن اگر کھانا چھوڑ دیں تو اس کا احساس ہو جائے گا۔ آپ کھانا کھاتے ہیں وہ اندر جا کر اپنا کام شروع کر دیتا ہے، یعنی خون بنتا ہے اور جو بے کار چیزیں ہیں، وہ باہر نکل جاتی ہیں۔ نئے خون بننے کی وجہ سے ہی انسان زندہ ہے۔ ایسے ہی ذاکر آدمی کی روح زندہ ہوتی ہے۔ ذکر روح کی غذا ہے۔ انسان بری چیزوں سے بچتا ہے۔

والدین کی غلطیوں کا بھگتان

ایک صاحب نے سوال کیا کہ ماں باپ کی غلطی بچوں کو کیوں بھگتنی پڑتی ہے؟ مولانا نے فرمایا: کمہار گھڑے بناتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں سیاہی ہو اور بھول سے گھڑے پر گر جائے تو گھڑا تو کالا ہو ہی جائے گا۔ اس میں گھڑے کی غلطی تو نہیں ہے، لیکن کالا تو ہو گیا۔ اسی طرح ماں باپ کی غلطیوں کا بھگتان اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔

مسلمانوں کی بے حمیتی

جیسے جذام (کوڑھ) کا مریض ہوتا ہے کہ جس جگہ جذام ہوتا ہے وہاں پر آپ

ٹھنڈی سے ٹھنڈی اور گرم سے گرم چیز رکھیے، دونوں کا اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح جس کے اندر دین کی حمیت ختم ہوگئی ہے۔ اس کے سامنے کچھ بھی کہو، کوئی پرواہ ہی نہیں۔ شریعت کے خلاف کہا جائے، عقیدے کے خلاف بات ہو، ان کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی۔ ایسے لوگ دینی اعتبار سے جذام کے مریض ہو چکے ہیں۔ ان کے ایمان کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔

اپنے برادران وطن کو اور ان کے مندروں کو دیکھ کر مجھے بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہوں اور ہمیشہ ان کو دیکھ کر بارہا یہ دعا پڑھتا ہوں: اللھم اھدھم واھدبھم ... تم لوگوں کو میری بے چینی کا کیا اندازہ؟ تم لوگ بے حس ہو چکے ہو۔ جیسے کانپور کے نزدیک جاج مئو ایک جگہ ہے۔ جہاں چمڑے کے کارخانے ہیں۔ اس راستے سے گزرنے میں اتنی تیز بدبو آتی ہے کہ آدمی بے چین ہو جائے اور برداشت نہ کر سکے۔ لیکن وہاں کے رہنے والے، اس میں کام کرنے والے کو کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ چوں کہ وہ وہاں رہتے رہتے اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سے ہمارے ہندستان کے مسلمان چاروں طرف شرک کو دیکھ دیکھ کر شرکیہ ماحول کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کو ایک پل کے لیے بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ خدا کی کھلی ہوئی نافرمانیاں ہو رہی ہیں۔ ان کا دل بے چین نہیں ہوتا۔

اہل مغرب کا حال

مغربی ممالک کے لوگ پانچ دن تو مشین ہیں، دن بھر کام کرتے ہیں اور دو دن سانڈ ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے کلچر کے چاروں پہیے بھرسٹ ہو چکے ہیں۔

شرک پیشاب پاخانے کی طرح ہے

شرک پیشاب اور پاخانے کی طرح ہے۔ جس طرح سے ایک کلو دودھ میں پچاس گرام پیشاب یا پاخانہ ڈال دیں تب بھی دودھ گیا، آدھا کلو ڈالیں تب بھی دودھ گیا اور اس کی بدبو بھی چاروں طرف پھیل جائے گی۔ قرآن شریف میں فرمایا گیا کہ اللہ کے

ساتھ اتنا بھی شرک نہ کرو، شَیْئًا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی اتنا بھی شرک نہ کرو۔ بعض لوگ اپنے سیاسی یا دنیوی مفاد کے لیے یہ چیزیں کر بیٹھتے ہیں کہ یہ شرک کہاں ہے؟ یہ تو ذرا سا ہم نے اس لیے کرلیا۔

امت حمادہ

اس مت کو امت حمادہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے امت کے افراد کو حمد کی کثرت رکھنی چاہیے۔

اخلاص کی حقیقت

اخلاص یعنی خالص، یعنی بغیر ملاوٹ کے دین۔ عبادات میں ریا کی ملاوٹ نہ ہو۔ تعلقات میں خودغرضی کی ملاوٹ نہ ہو اور زندگی کے جتنے مشہور شعبے ہیں، ان میں کسی چیز کی ملاوٹ نہ ہو۔ خالص رضائے خداوند قدوس کے لیے عمل کیا جائے۔ کوئی دوسری غرض اس میں شامل نہ ہو۔ صحابۂ کرام دنیا کو دین بنا کر کام کرتے تھے اور آج ہمارا حال یہ ہے کہ دین کا کام بھی دنیا کے لیے کر رہے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے جو تابعین میں ہیں، فرمایا تھا: ''صحابہ اور ہم میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اگر صحابہ ہمیں دیکھتے تو کہتے تم منافق ہو اور اگر ہم صحابہ کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ پاگل ہیں، دیوانے ہیں۔ یہ کب کی بات ہے اور آج کل تو حالات بد سے بدترین ہوتے جا رہے ہیں۔

علوم لیں، تہذیب نہ لیں

ہر حکمت والی چیز مومن کا گم شدہ مال ہے۔ اس لیے فرمایا گیا: الحکمة ضالة المؤمن. ہمیں ان (اہل مغرب) کے کلچر کو، ان کی تہذیب کو نہیں لینا ہے۔ ان کی ٹکنالوجی اور سائنس سے فائدہ اٹھانا ہے۔

معرفت الٰہی کا نتیجہ

ایک جگہ دعوت تھی۔دستر خوان لگا ہوا تھا۔سب ہاتھ دھو کر دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ اس وقت دستر خوان پر پلیٹ کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔لوگوں کا بیٹھنا تھا کہ ایک صاحب نے ایک چھوٹی سے کھڑکی کھول کر کہا کہ بھیج دو۔اسی وقت کھڑکی سے کھانا آنا شروع ہو گیا۔ مولانا جب کھانا کھا کے بیٹھے تو فرمایا: یہی حال ہوتا ہے اللہ والوں کا جن پر اللہ کی معرفت کی کھڑکیاں کھل چکی ہیں۔ان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہاں سب کچھ تیار ہے، بس مانگنے کی ضرورت ہے اور مانگتے ہی ملنا شروع ہو جاتا ہے۔تاریخ اس کی گواہ ہے۔ہمارے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے نہ جانے کتنے ایسے واقعات ہیں۔حضرت سید صاحب فرماتے تھے کہ عرب کا صحرا ہو اور پوری دنیا کے لوگ میرے ساتھ ہوں تو بھی مجھے ایک پل کے لیے یہ خیال نہ ہوگا کہ ان کو کہاں سے کھلاؤں۔یہ کیا چیز تھی؟ یہ ان کی معرفت اور ان کے ایمان کی بات تھی۔

اہل ایمان: چت بھی اُن کی، پٹ بھی اُن کی

کوئی شخص اکیلے بیٹھا ہو کسی اہم فکر میں اور کوئی پیچھے سے آ کر دھیرے سے ایک جھانپڑ لگا دے، تو اس وقت کیا کیفیت ہوگی؟ وہ تلملا اٹھے گا کہ عنقریب اسے مار دے۔ لیکن اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ اس کا محبوب جس سے اسے بہت محبت ہے، تو اس کا کیا حال ہوگا؟ شرم کے مارے پانی پانی ہو جائے گا، بل کہ چاہے گا کہ ایک دو اور لگا دے اور اس کا سارا غصہ خوشی میں تبدیل ہو جائے گا۔اسی طرح سے جب اللہ والوں پر پریشانی آتی ہے یا بیماری آتی ہے تو ان کی نگاہ اللہ پر ہوتی ہے اور وہ مطمئن ہوتے ہیں اور صبر کے ذریعے اپنے مقامات کو بلند کرتے ہیں۔میں کہتا ہوں کہ چت بھی ایمان والوں کی اور پٹ بھی۔ جب اللہ کی طرف سے انعامات کی بارشیں ہوتی ہیں تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور جب بیماری یا مشکلات آتی ہیں تو یہ سوچ کر کہ یہ میرے محبوب کی طرف سے ہیں، اس پر صبر

کرتے ہیں، اس طرح صبر وشکر سے وہ اپنے درجات کو بلند کرتے ہیں اور اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔

آزمائشوں کی مثال

جب بچہ پینٹی میں پیشاب یا پاخانہ کردیتا ہے تو ماں دھلاتی اور صفائی کرتی ہے۔ اس وقت بچے کو تکلیف ہوتی ہے۔ بچہ چلاتا اور روتا ہے، لیکن ماں چھوڑتی نہیں، جب تک کہ پاک صاف نہ کردے۔ پاک صاف کرنے کے بعد اس کو پیار کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں سے ماں سے زیادہ محبت کرنے والا ہے، وہ بیماریوں اور آزمائشوں کے ذریعے بندوں کو پاک صاف کرتا ہے اور ان کے درجات کو بلند کرتا ہے اور پھر اپنے پاس بلاتا ہے۔

بے ادبی بری بلا ہے

بے ادبی بہت بری بلا ہے۔ کبھی کسی اللہ والے کی بے ادبی نہ کرنا۔ بے ادبی سے توفیق سلب ہوجاتی ہے۔ بعض دفعہ ایمان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ یہ جو فرقے پیدا ہوئے ہیں یا راہ سے ہٹی ہوئی جماعتیں ہیں، ان کے ہاتھوں سے کہیں نہ کہیں کسی اللہ والے کی شان میں گستاخی یا تحقیر کی کوئی بات معلوم ہوگی، جس کی وجہ سے وہ راستے سے ہٹے اور توبہ کی توفیق نہ ہوئی۔ پہلے خود ڈوبے اور پھر دوسروں کو بھی لے ڈوبے۔

اہل اللہ کی صحبت لازمی ہے

صحبت ضروری ہے۔ جو اہل اللہ کی صحبت اختیار نہیں کرتے چاہے وہ بڑے لوگ ہوں، شیطان ان کو اوپر لے جاکر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کو بہت کچھ سمجھنے لگتے ہیں اور اوپر سے نیچے گرتے ہیں۔ چھوٹے اور بڑے لوگوں میں یہی فرق ہے کہ جہاز پرواز کررہا ہو اس سے جو گرے گا وہ چور چور ہوجائے گا اور سائیکل سے جو گرے گا اس کا حال ویسا نہیں ہوگا، کچھ ٹوٹے پھوٹے گا۔

حلال وحرام کی فکر ضروری

بطن کا باطن سے بڑا تعلق ہوتا ہے۔ پیٹ میں اگر حرام لقمہ جائے گا تو دل بری عادتوں کی طرف مائل ہوگا۔ اگر لقمہ حلال جائے گا تو باطن اچھا ہوگا۔ باطن کو اچھا کرنے کے لیے حرام اور حلال کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔

داعی کے لیے ضروری باتیں

چند باتیں ایسی ہیں جن کی طرف خاص توجہ ضروری ہے، جس کے بغیر آپ کوئی نمایاں کام نہیں کر سکتے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ استحضار نیت ہو کہ ہم کو جو کام بھی کرنا ہے اللہ کے لیے کرنا ہے۔ بس یہیں آپ کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ دو تہائی مسئلے آپ کے استحضار نیت سے حل ہو جائیں گے۔ کیوں کہ آدمی بات کرتا ہے تو غصہ آتا ہے۔ اگر اللہ کے لیے کرے گا تو غصہ نہیں آئے گا اور اگر غصہ آئے گا بھی تو وقت پر آئے گا اور ضرورت کے تحت آئے گا۔ پھر فوراً ٹھنڈا ہو جائے گا جیسے سچا آدمی ہوتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہم کو راستہ مل جائے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ہم کام یاب ہوئے یا ناکام ہوئے۔

دوسری چیز جس کا اہتمام ضروری ہے اکل حلال ہے۔ اکل حلال بہت اثر ڈالتا ہے۔ کیوں کہ اکل حرام سے زبان خراب ہو جاتی ہے، دل خراب ہو جاتا ہے۔ دعوت کے کام میں اکل حلال بہت ضروری ہے اور اس میں آپ اپنے آپ کو جتنا تیار کر سکیں، کریں اور کوتاہی نہ کریں۔ ابھی سے آپ اس کی تیاری کریں۔ ابھی سے کوئی حرام لقمہ آپ کے اندر نہ جائے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ کام کی تشہیر اور پروپیگنڈہ نہ کریں بل کہ اخفاء سے کام لیں، اس کام کو خفیہ رکھا جائے۔ بہت زیادہ چرچا نہ کریں اور لوگوں سے زیادہ نہ بتائیں۔ اس سے لوگوں میں حسد پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ شہرت چاہتے ہیں۔ کیا تو کچھ بھی نہیں اور

صاحب اپنی شہرت میں کام بند کراڈالیں گے۔شہرت خوب کردی کہ لاکھ ہوگئے، دس لاکھ ہوگئے اور ہوا کچھ بھی نہیں۔

ذکرِ الٰہی کی ثمرات

استحضار کے ساتھ اللہ کی عبادت ہوگی تو اس کے ثمرات ظاہر ہوں گے۔سب سے بڑا فائدہ اللہ کے ذکر کا یہ ہوگا کہ اللہ کی ذات پر یقین پختہ ہوگا۔اللہ پر توکل بڑھے گا۔ اللہ سے محبت بڑھے گی۔اللہ کی محبت، یقین اور توکل سے ہمارا دل سرشار ہوجائے گا تو مکمل کام یابی حاصل ہوجائے گی۔دنیا کی کام یابی اور آخرت کی کام یابی ہوگی۔اللہ کو یاد کرنے اور اللہ کا ذکر کرنے میں لذت آنے لگے گی۔انسان بڑی سے بڑی پریشانی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے گا۔اس کا یقین ہوگا کہ جو کچھ ہورہا ہے، اللہ کے حکم سے اور اس کی مشیت سے ہورہا ہے۔کبھی بھی اس کا ایمان اور توکل متزلزل نہیں ہوگا۔

انقلاب قرآن ہی سے آئے گا

دنیا میں ایسی کوئی قوم موجود نہیں، جس کے پاس چودہ سو سال کا کوئی سرمایہ جوں کا توں موجود ہو۔جس کے پاس بھی پہلے سرمایہ تھا، وہ لٹ پٹ گیا، ختم ہوگیا اور اس کا نام بھی برائے نام باقی ہے۔اس لیے جو منصف ہیں، وہ قرآن پر رشک کرتے ہیں اور جو غیر منصف ہیں، وہ حسد کرتے ہیں۔قرآن ایک ایسی چیز ہے، ایسی زندہ جاوید کتاب ہے اور ایسی جوان اور زندگی سے بھرپور ہے کہ جو اس سے جڑ جائے، جوان ہوجائے گا، صاحب بصیرت ہوجائے گا۔انقلاب اسی قرآن کی روشنی میں پیدا ہوگا۔کسی نظام میں طاقت نہیں۔ وہ اندر سے کھوکھلے اور بہت بودے ہیں۔ان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔وہ اپنی افادیت کھوچکے ہیں۔وہ قرآن پاک کے انقلاب سے خائف ہیں۔اس لیے غلط پروپیگنڈے کررہے ہیں۔دہشت گردی کے عنوان پر دہشت گردی کو جنم دے رہے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں، اُن کی یہ سازشیں بے نقاب ہوجائیں گی اور اپنے بچھائے ہوئے جالوں میں خود پھنس جائیں گے۔

دین و دنیا کی مماثلت

دین و دنیا ساتھ چلتے ہیں۔ ایک خراب ہو اور دوسرا صحیح، ایسا نہیں ہوتا۔ جس طرح دنیوی چیزوں میں ملاوٹ ہوگئی ہے اور ان کے کھانے سے متعدد امراض پیدا ہوتے ہیں، اُسی طرح دین کا کام کرنے والوں کے یہاں بھی اخلاص کے نہ ہونے سے بہت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح دنیوی چیزوں میں ملاوٹ نہ کرنے والے مخلصین کی کمی ہے، اُسی طرح دین کا کام کرنے والوں میں بھی مخلص کم ہوتے جا رہے ہیں اور دھیرے دھیرے بالکل ہی کم ہو جائیں گے۔

ایمان کیسے تازہ ہو؟

ایمان والوں کی مجلسوں میں بیٹھنے سے سب سے زیادہ ایمان تازہ ہوتا ہے۔ دوسرے درجے میں ایمان والوں کی باتیں سننے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ تیسرے درجے میں جہاں ایمان والوں کا تذکرہ ہو، وہاں بیٹھنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔

نماز و دعا میں دل نہ لگنا

عام طور پر دو باتوں کی وجہ سے نماز اور دعا میں دل نہیں لگتا۔ ایک اکل حرام اور دوسرے بدنظری۔ اس لیے ان دونوں چیزوں سے ہمیشہ خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو اور کوشش جتنی ہوگی، فائدہ بھی ویسا ہی نظر آئے گا۔

مکاتب کی اہمیت

یہ چھوٹے چھوٹے مکاتب ہماری بنیاد ہیں۔ بنیاد کے بغیر عمارت بن ہی نہیں سکتی۔ یہ ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ جیسے کوئی الفاظ نہ جانے، حروف تہجی نہ جانے، الف با، A, B, C, D کس کو کہتے ہیں، اگر کوئی یہ نہ جانے تو ''ابجد'' میں کیسے جائے گا؟ پہلے تو الف، با جاننا ہوگا۔ ایسے ہی مکاتب بھی ہیں۔ یہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ لوگ ان کو نظر انداز کر دیتے

ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ معمولی ہیں، لیکن درحقیقت یہ غیر معمولی ہیں۔ یہ بنیاد ہیں۔ ان ہی پر ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ بڑے مدارس ان ہی سے چل رہے ہیں۔ یہ چھوٹے مدارس سپلائی کرتے ہیں تو آگے کام چلتا ہے۔ ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ان پر خرچ کرنا، اپنا مال اور وقت لگانا بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ ہماری بنیاد ہیں اور ان سے ہماری پوری نئی نسل وابستہ ہے۔

پیغمبروں کا طریقۂ کار

پیغمبر دل کو مخاطب کرتے ہیں اور دل بدلتے ہیں۔ سوچ صحیح کرتے ہیں۔ کیوں کہ اگر دل میں برائی ہے تو قانون اس کو نہیں روک سکتا۔ اس لیے اندرونی تبدیلی کی ضرورت ہے اور اندرونی تبدیلی کے لیے دنیا کی پوری تاریخ میں ''ایمان'' سے بڑھ کر کسی طاقت اور تربیت کا تجربہ نہیں ہوا۔ جب تک عوام میں خدا کا یقین اور اس کا خوف اور خدائی پوچھ گچھ کا کھٹکا پیدا نہ ہوگا، اخلاق اور آدمیت کا سراپا تھ نہ آئے گا۔

محبت کی تاثیر

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر کسی کو کسی سے محبت ہو تو اس کو بتا بھی دے۔ بتانے سے محبت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور محبت سے توجہ ہو جاتی ہے اور توجہ سے محبت کا فائدہ حاصل ہونے لگتا ہے۔ محبت بھی عجیب چیز ہے۔ جب محبت سے آدمی دیکھتا ہے تو اس کے اثرات پڑ کر رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ چہرے میں بھی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب آدمی کو کسی اللہ کے نیک بندے سے زیادہ محبت ہو جاتی ہے تو اخیر میں اس کے چہرے پر بھی اثرات پڑنے لگتے ہیں۔ محبت کرتے کرتے، ساتھ رہتے رہتے بعض دفعہ لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ وہی آ رہا ہے۔ جب دو طرفہ محبت ہوتی ہے تو یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔

انسانیت کی فلاح کا واحد نسخہ

انسانیت اپنی حقیقی فلاح و بہبود کو اُسی وقت حاصل کرسکتی ہے جب کہ وہ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام لے، جو نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کی گئی۔ درحقیقت انسانیت کی کامیابی و کامرانی اسی کتاب پر منحصر ہے۔ کیوں کہ باطل نہ تو اس کے سامنے سے حملہ آور ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے کی جانب سے پر مار سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تمام تعریفوں کے سزاوار خداوند حکیم کی جانب سے نازل ہوا ہے۔

مکمل اسلام کو اپنایئے

ارشاد باری تعالیٰ ہے "اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً" یعنی اسلام میں مکمل داخل ہوجاؤ۔ اسلام مکمل اسی وقت کہا جائے گا، جب اس کے تمام گوشوں پر عمل ہوگا۔ آج ہماری عبادات تو بہت اچھی ہیں۔ نمازیں اچھی پڑھی جارہی ہیں، روزے بھی اہتمام سے ادا ہورہے ہیں، ماشاء اللہ خوش حالی ہے تو حج بھی کیے جارہے ہیں مگر معاملات کے باب میں ہم بہت پیچھے ہیں۔ کم زور طبقات کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہورہا ہے۔ ان کی حق تلفی ہورہی ہے۔ سماج کا وہ طبقہ جو عورتوں، ضعفاء، کم زوروں اور مزدوروں پر مشتمل ہے، بے حد پریشان ہے۔ مغربی اقوام نے عورتوں کو ترقی کے نام پر کسی کام کا نہ چھوڑا۔ اُن کو بازار کی سب سے ارزاں شئے بناڈالا اور اب ہم بھی ان کے ساتھ یہی سلوک کررہے ہیں۔ چوں کہ ہم مسلمانوں نے عہد کررکھا ہے کہ من وعن ان کی تقلید کرنی ہے، لہٰذا اس باب کو بھی کیوں تشنہ چھوڑیں؟ ان کی شرم وحیا کا گلا گھونٹ کر سربازار نیلام کیا جارہا ہے۔ سماج کا وہ طبقہ جو ہمارے حسن سلوک کا، مروت وہم دردی کا اور رعایت وتوجہ کا مستحق تھا، اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جارہی ہے۔ اسلامی حسن سلوک کی جو شکلیں ہیں، اُن کو اگر مسلمانوں نے اپنایا ہوتا تو اس ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

فارغین مدارس کا مصرف

جو طلبہ تعلیم میں اعلیٰ درجے کے ہوں، اُن کو مدارس میں لگنا چاہیے۔ جو دوسرے درجے کے ہوں، انھیں بیرون ملک بھیجا جاسکتا ہے۔ جو تیسرے درجے کے ہوں، وہ یونی ورسٹیوں میں لگ سکتے ہیں اور آخری درجے کے طلبہ تجارت وکاروبار میں لگ سکتے ہیں۔

لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ ممتاز اور اچھے طلبہ مدارس میں آ ہی نہیں پاتے۔ نہ وہ آتے ہیں اور نہ ہم لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر مدارس سے خاطر خواہ نتائج نہ ظاہر ہونے کا رونا روتے ہیں۔

ہر زبان ہماری ہے

دنیا کی ہر زبان ہماری ہے۔ ہم اللہ کے ہیں۔ اللہ کی حمد وثنا اور اس کے خاتم الانبیاء ورسول مقبول ﷺ کی مدح وتوصیف اگر عربی زبان میں ہے اور فارسی اور اردو کو اس پر ناز ہے تو دیگر زبانوں کو بھی اس کا پورا پورا حق ہے کہ وہ بھی حمد خداوندی کی خوش بو سے اور مدح نبوی ﷺ کے عطر سے اپنے کو مہکائیں۔ اس لیے دیگر زبانوں میں بھی حمد وثنائے وحدہٗ لاشریک اور مدح وتوصیف رحمۃ للعالمین ہونی چاہیے۔ تاکہ معرفت الٰہی کا نور اور سنت نبوی کی برکت ان کو بھی حاصل ہو اور یہ زبانیں بھی قیامت میں عربی زبان نہ سہی، اردو اور فارسی کے پہلو میں کھڑے ہونے کے لائق ہوسکیں۔

علم یا جہل؟

آج دنیا نے علم کو مال کے تابع کر دیا، اس لیے یہ علم وبال ہو گیا۔ ساری انسانیت کے لیے کلنک کا ٹیکا ہو گیا۔ اسی وجہ سے جو علم سیکھ رہا ہے، وہ آج نفع پہنچانے کے بہ جائے نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس لیے کچھ ڈاکٹر تو ڈاکٹر بنتے ہیں لیکن بہت سے ڈاکو بن جاتے ہیں۔ ان کے پاس علم تو ہے لیکن گردے نکال کر بیچنے کا علم ہے۔ علم ہے، لیکن راکٹ بنا کر انسانوں کو ہلاک کرنے کا علم ہے۔ علم ہے، لیکن زہریلی گیس بنا کر چھوڑنے اور انسانوں کو

تباہ کرنے کا علم ہے۔تو حقیقتاً وہ علم نہیں، بڑے درجے کی جہالت ہے اور بڑے بڑے اس علم کو جاننے والے ٹھیکے دار موجود ہیں، لیکن وہ دنیا کے اتنے بڑے جاہل ہیں کہ شاید پوری تاریخ انسانی میں اتنے بڑے جاہل کبھی پیدا نہ ہوئے ہوں گے۔ایسا صرف اس لیے ہے کہ یہ علم مال کے تابع ہے۔

تصنیف و تالیف کا مقصد

تالیف و تصنیف کے اس پامال کوچے میں صرف اس مقصد سے مت قدم رکھنا کہ میری بھی کوئی نئی کتاب آجائے۔موضوع کی ضرورت کا اندازہ کر کے خلوص نیت سے یہ کام کرنا۔دنیا ہمیشہ تمہاری تحریروں سے استفادہ کرے گی۔ورنہ روزانہ سیکڑوں کتابیں چھپتی ہیں۔خود رسم اجراء کرائیے۔تبصرے کے نام پر تقریظیں لکھوایئے۔یہاں وہاں لے جا کر دکھایئے اور داد وصول کرتے رہیے۔زمانہ آج بھی جوہر شناس ہے۔اگر وہ کام اخلاص کی روح سے خالی ہوگا اور محض خانہ پُری کے لیے کیا گیا ہوگا، تو یاد رکھو! لائبریریوں میں اس کے نسخے تو محفوظ ہو جائیں گے لیکن دوسرے ایڈیشن کی نوبت تو کیا، پہلا ایڈیشن ہی تحفوں کے فضل و کرم سے نکالنا پڑے گا۔

حصول علم کا مقصد

اس بات کا بہت دھیان رکھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ کے لیے علم حاصل کیا جائے اور اللہ ہی کے لیے دوسروں تک پہنچایا جائے۔اس میں کسی طرح کی غرض شامل نہ ہو۔اگر اس میں غرض شامل ہوگی تو سارا علم ملیا میٹ ہو جائے گا۔یعنی اگر یہ ذہن میں ہے کہ یہ بہت بڑے عالم ہیں، علامہ ہیں، صاحب تصنیفات ہیں، بڑے بڑے نکتے بیان کرتے ہیں، ان کے مضامین پرچوں میں چھپتے ہیں، ان کی تقریریں ریڈیو سے نشر ہوتی ہیں، لوگ ان سے بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ان کا ہر طرف چرچا ہے، تو حدیث میں آتا ہے کہ ایسے شخص کو آخرت میں بلایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تمہیں دنیا میں علامہ کہا جا چکا۔پھر اس کو

اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا کہ تمھیں دنیا میں علامہ کہا جاچکا۔اسی لیے ہمارے علماء ہمیشہ اس سلسلے میں بہت محتاط رہے ہیں۔

جہیز اور بارات

جہیز اور بارات کا سلسلہ درحقیقت ڈاکوؤں کا قافلہ ہے، جو دن دہاڑے لڑکی کے ہاں سے لوٹ کر مال لے جاتے ہیں۔لڑکی کو بھی لے جارہے ہیں اور مال بھی لوٹ کر لے جارہے ہیں۔

رزق حلال کی اہمیت

فیکٹری میں جب اچھا اور Pure مال جائے گا تو اچھی چیزیں تیار ہوں گی اور خراب مال جائے گا تو گھٹیا چیزیں تیار ہوں گی۔ایسے ہی آدمی جب حرام کھائے گا تو کام بھی خراب کرے گا اور حلال وطیب کھائے گا اور اپنی اولاد کو بھی کھلائے گا تو اچھے نمونے سامنے آئیں گے اور کام بھی ہوگا۔

سب سے بڑی کرامت

لوگ بزرگ اس کو مانتے ہیں، جس سے خارق عادت کرامات کا ظہور ہو۔ہمارے نزدیک سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ وہ فرائض وواجبات، حقوق اللہ وحقوق العباد کا اہتمام کرتا ہو۔معاملات صحیح ہوں۔اگر یہ چیزیں نہیں ہیں، تو کیسی ہی کرامات صادر ہوجائیں، بزرگ نہیں ہوسکتا۔

روح اور جسم

جس طرح جسم کی توانائی کے لیے کھانا بھی ضروری ہے اور کام کرنا بھی ضروری ہے، اسی طرح علم اور ذکر بھی ضروری ہے تاکہ روح تروتازہ رہے اور اس کے اندر زندگی کی شادمانی اور روانی باقی رہے۔ورنہ روح مرجائے گی اور روح مرجائے گی تو جسم بے کار

ہو جائے گا اور اگر جسم مر گیا تو روح کو بھی ترقی نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ دنیا میں بغیر روح کے جسم نہیں اور بغیر جسم کے روح نہیں۔ اس لیے دونوں پر محنت ضرورت ہے۔

دل شکنی اور حق شکنی

ایک ہے دل شکنی اور ایک ہے حق شکنی۔ میں ہمیشہ دل شکنی کو حق شکنی پر ترجیح دیتا ہوں۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ ہم سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

مختلف صحبتوں کی تاثیر

جو اپنے بڑوں کے ساتھ رہے گا، اس کو اپنی کم علمی اور چھوٹے پن کا احساس ہوگا اور وہ اپنی کمیاں دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ جو اپنے چھوٹوں کے ساتھ رہے گا، وہ کبر میں مبتلا ہوگا اور جو اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ رہے گا، وہ لاابالی پن میں مبتلا ہوگا۔

تھک کر رکنے والا مخلص نہیں ہوتا

جو اخلاص کے ساتھ دین کا کام کرے گا، وہ کبھی تھکے گا نہیں۔ خواہ اس کام کے نتائج ظاہر ہوں یا نہ ہوں۔ کیوں کہ اس کے پیش نظر رضائے الٰہی اور اطاعت خداوندی ہے۔ لوگ چاہے اس کے ساتھ جیسا بھی رویہ رکھیں، وہ اپنا کام کرتا رہے گا۔ مگر جو کسی اور مقصد سے کام کرے گا، اگر وہ مقصد حاصل نہ ہوا تو وہ تھک جائے گا، اکتا جائے گا۔ یہ تھکنا ہی دلیل ہے مخلص نہ ہونے کی۔ کام کرتے رہنا چاہیے۔ اثرات مرتب ہوں یا نہ ہوں۔ اثرات مرتب نہ ہونے پر کام سے رکنے کا مطلب اللہ کے لیے کام نہ کرنا ہے۔

طلبہ مطالعے کا معیار بلند کریں

معیاری کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے اور مطالعے کا معیار نہایت بلند رکھنا چاہیے۔ خاص طور پر مکتوبات امام ربانی یا اس کی وہ تلخیص جو مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے تجلیات ربانی کے نام سے کی ہے، ضرور پڑھنی چاہیے۔ اسی طرح شاہ اسماعیل شہیدؒ کی منصب

امامت، مولانا سید بدر عالم میرٹھی کی ترجمان السنۃ، علامہ شبلی نعمانی و علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی، اور علامہ کی خطبات مدراس، حضرت مولانا کی نبی رحمت، منصب نبوی اور تاریخ دعوت وعزیمت اور سید احمد شہید کی صراط مستقیم بھی ضرور پڑھو۔

بے فکری عدم طلب کی دلیل ہے

طلب اور بے فکری ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بے فکری عدم طلب کی دلیل ہے۔ طلب تو یہ ہے کہ کسی چیز کے لیے اس درجہ بے چینی ہو کہ جب تک وہ مل نہ جائے، دل کو کسی پل قرار نہ آئے۔ سالک راہِ تصوف کو بھی یہ بات ہمیشہ ملحوظ ذہنی چاہیے۔

جس گل کو دل دیا ہے، جس پھول پر فدا ہوں
یا وہ بغل میں آئے، یا جاں قفس سے چھوٹے

مسلمانان ہند کی فلاح

ہندستانی مسلمانوں کی فلاح کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں۔ ایک دعا اور دوسرا دعوت۔ ان دونوں پر بہ یک وقت اور مضبوطی سے چل کر ہی وہ کام یاب ہو سکتے ہیں۔

پیام انسانیت کیا ہے؟

پیام انسانیت اصلاً یہی ہے کہ جو احسان والے کام ہیں، وہ کام کرنے والے بن جائیں، زبان سے بھی لوگوں کو دعوت دیں کہ انسان بنو، حیوان نہ بنو۔ یورپ نے تم کو حیوانیت سکھائی ہے، اسلام تم کو انسانیت سکھاتا ہے اور انسانیت ہمیشہ کی طرح اسلام کے پاس ہے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں ہے۔ سب کی جھولی خالی ہے۔ باتیں بنا لینا الگ چیز ہے لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ دکھایئے تو نہیں دکھا پائیں گے۔ ہے ہی نہیں تو کہاں سے دکھائیں گے؟ سب کے سب دیوالیہ ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ لوگ چمک دمک سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ان کی چمک دمک سے ہمارے لوگ بھی فریب میں آ جاتے ہیں۔

تحریک پیام انسانیت

سرزمین ہندستان کو ہم وار کرنے اور یہاں والوں کے دلوں کو تیار کرنے میں پیام انسانیت تحریک بہت مؤثر رول ادا کرسکتی ہے، بل کہ یہ تحریک دعوتی کام کو کام یاب بنانے میں بہت ہی مفید اور نفع بخش کردار ادا کرسکتی ہے۔تحریک کے داعی اول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنے انٹرویو میں یہ بات کہی تھی کہ ''پیام انسانیت کی تحریک ملک کی تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے۔'' خاص طور سے آج کل کے حالات کی ابتری، اخلاقی انارکی اور خونِ انسانی کی ارزانی کو دیکھتے ہوئے اس کی اہمیت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

انسانیت کا احترام ابھی باقی ہے

پیام انسانیت کے پروگرام کے لیے لوگوں کی دل چسپی اور فکرمندی بتاتی ہے کہ انسانیت ابھی باقی ہے۔اس کی فکر کرنے والے ابھی موجود ہیں۔انسانیت کا احترام باقی ہے۔ اس سے محبت اور پریم کرنے والے باقی ہیں۔انسانیت کے لیے محبت ختم نہیں ہوئی ہے، ہاں! کم ضرور ہوگئی ہے۔ضرورت ہے اس جذبے کو فروغ دینے کی۔اس چراغ محبت کی لو کو تیز کرنے کی۔اگر اس جذبے کو، انسانیت کے احترام کو بڑھایا نہ گیا اور یہ کم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا تو وہ بہت برا دن ہوگا۔

وطن عزیز کی خبر لیجیے

آج وطن عزیز کو نقصان پہنچایا جارہا ہے۔اس کو کھوکھلا کیا جارہا ہے۔ملک ہر اعتبار سے زوال کی طرف جارہا ہے۔ہم سب ایک ہی جہاز پر سوار ہیں، جس میں ہر طرف سوراخ کیا جارہا ہے۔ہر جگہ ایسے لوگ بیٹھ گئے ہیں جو اس کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔کوئی چھوٹا سوراخ کررہا ہے تو کوئی بڑا سوراخ کررہا ہے۔جس کو جس قدر موقع مل رہا ہے وہ سوراخ کرنے سے چوک نہیں رہا ہے اور اگر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو سوراخ

نہیں بل کہ پورا کا پورا پیندا ہی غائب کرنے میں لگے ہیں۔ایسا کیوں ہے؟ یہ سب ذاتی مفاد کے تحت ہو رہا ہے۔ضرورت ہے اس فکر کو بدلنے کی۔

گرتوں کو سنبھالیے

آپ دوسروں کا درد بانٹیے۔دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہیے۔درد دل پیدا کیجیے۔دوسروں کے کام آیئے۔آج مزاج یہ ہوتا جا رہا ہے کہ جو گر رہا ہے اسے ایک اور دھکا دے دو۔نبی پاک ﷺ گرتوں کو سنبھالا دیتے تھے۔ہم بھی گرنے والوں کو پکڑیں۔ پریشانیوں سے نجات دلائیں۔انسان خود کردہ مصیبتوں سے پریشان ہے۔آپ اس کے حق میں نجات دہندہ بن جائیں۔آج دنیا پھر سے تباہی کے غار میں گر رہی ہے۔آپ اس کے حق میں چارہ ساز بنیں۔کوشش ضرور کریں خواہ جس درجے میں بھی ہو۔کیوں کہ بیج ڈالنا ہمارا کام ہے۔پھل لانا اللہ کے اختیار میں ہے۔

داعی اسلامؒ کا آخری پیغام: آپ کے نام

اس دنیا میں ہم لوگ دعوت و اصلاح کا کام کرنے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اس کام کے لیے منتخب فرماتے ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے۔ صحابہ، علماء اور مصلحین آئے۔ سب اپنا کام کر کے رخصت ہو گئے۔ کسی کو کام کرنے کا زیادہ اور کسی کو کم موقع دیا گیا۔ یہ اللہ کا نظام ہے۔ اس کی حکمت و مصلحت ہے۔ مجال دم زدن معاذ اللہ۔ اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھیں، جس کو جتنی عمر دیں، جس کو جتنا موقع دیں، ان کا فضل ہے۔ وہ اپنے بندوں پر فضل ہی فرماتے ہیں۔ زمان و مکان سب ان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ جس بندے کو جہاں رکھیں، جس طرح رکھیں، ان کا فضل ہی فضل ہے۔ بندے کی شان بندگی یہ ہے کہ وہ ہر حال میں راضی رہے۔ اس کے فیصلے پر، اس کے ہر حکم پر لبیک کہے۔ حضرت رسول پاک ﷺ کو ۶۳ رسال عمر دی گئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی ۶۳ رسال کا وقفۂ حیات دیا گیا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے ۴۶ رسال کی عمر میں جام شہادت نوش فرمایا۔ سید صاحب نے کس قدر قلیل عرصے میں کتنے کثیر و عظیم کام انجام دیے۔ دعوت و اصلاح کا، دینی تعلیم کی اشاعت کا، سنت و شریعت کے فروغ کا، نظام حق نافذ کرنے کا۔ ان سب باتوں کا تصور بھی اتنے قلیل عرصۂ حیات میں محال ہے۔ یہ سب مالک کی توفیق سے ہوتا ہے۔ یہ حیاتِ مستعار اللہ کا انعام ہے۔ اس میں بندہ اللہ کے دین کا کچھ کام کر جائے تو کیا کہنے۔

ہمارا آپ کا کافی دن ساتھ رہا۔ ہمارے کاموں کو آپ دیکھ رہے ہیں۔ میری محنت اور جدوجہد آپ کے سامنے ہے۔ آپ کوشش کریں کہ یہ سلسلہ ختم نہ ہو۔ اپنے ساتھیوں کو، شاگردوں کو، اولاد کو اور اپنے خاندان کو اس مشن پر لگائیں۔ لوگ آئیں گے جائیں گے۔ ان شاء اللہ یہ کام ختم نہیں ہوگا۔ محنت کرنے والے اجر پائیں گے۔

باطل طاقتوں سے، شر پسند قوتوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ بہ ظاہر بڑے وسائل والے ہیں، لیکن اللہ کی طاقت سب سے بلند و برتر ہے۔ مسلمان مسلمان بن کر رہیں، ایمان و تقویٰ پر قائم رہیں، اجتماعیت کو ختم نہ کریں، ان شاء اللہ کوئی بھی ان کا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ اللہ کی مدد شامل حال رہے گی۔ وَأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين۔